ادبی تجزیے

(تحقیقی و تنقیدی مقالات)

ڈاکٹر قاسم جلال

فہرست

○ قاسم جلال ــــ ایک کامیاب محقق (ڈاکٹر نواز کاوش) ۷

اصناف سخن

○ اردو غزل کا آغاز و ارتقاء ۱۴
○ اردو نظم کا تاریخی و فنی پس منظر ۳۷
○ اردو مرثیہ - ماضی و حال کے آئینے میں ۴۷
○ اردو قطعہ نگاری کے خدوخال ۵۴
○ اردو افسانے میں علامت کا استعمال ۶۰

شخصیات

○ رئیس امروہوی کے شخصی و فنی کمالات ۶۵
○ شہاب دہلوی کی غزل کے عناصر ترکیبی ۸۲
○ عارف رحمانی کے فکری زاویئے ۸۷

کتب

○ "قانون مکافات" ایک منفرد علمی سوغات ۹۳
○ "موج نور" کا تجزیاتی مطالعہ ۹۵
○ جعفر بلوچ کی دو اہم تصنیفات کا مختصر جائزہ ۱۰۱

قاسم جلال --- ایک کامیاب محقق

تحقیق اور تنقید کے میدان میں وہ پیش رفت نہیں ہو سکی جو ادب کے صحت مند رجحانات کی نشاندہی کرتے ہوئے مستقبل کے امکانات کا احاطہ کر سکے۔ اردو میں یہ شعبہ اس لئے بھی پنپ نہیں سکا کہ یہ جان جوکھوں کا کام ہے اور پرخارو سنگلاخ رستوں کا انتخاب ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ پھر تحقیق و تنقید کے لئے مختلف زمانوں کے علمی و ادبی ورثے سے آگہی' زبانوں کی تاریخی اور تدریجی و ارتقائی مراحل سے آشنائی اور معاصر ادبی پس منظر و پیش منظر پر دسترس ہونا ضروری ہے۔ اردگرد کے علاقوں میں مروج زبانوں کے اردو پر ہونے والے اثرات اور مغربی ادبی اقدار کی بدلتی ہوئی فکری اساس کے بارے میں جاننا بھی شرط ہے۔ لہٰذا ان گورکھ دھندوں میں جان کھپانا اور کسی تخلیق کی پرکھ کے لئے قدم اٹھانا دشوار کام ہے۔ عمیق مطالعہ استدلالی و منطقی طرز احساس اور دوسری زبانوں کے ادب کا تقابلی ادراک بہت ناگزیر ہوتا ہے۔ زمانے کی بدلتی اقدار' تحریکوں' فلسفوں اور نفسیاتی تغیرات سے آگہی کے بعد تخلیقی سمندر سے موتی نکالنا گہری شعوری مشقت کے باعث ہی ممکن ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی سے حسن عسکری تک اور وزیر آغا سے قاسم جلال تک اس دشت میں مٹھی بھر دانشور اسالیب' ادبی اصولوں اور معیارات کی راہیں متعین کرنے میں مصروف عمل ہیں۔

قاسم جلال کی زیر نظر کتاب "ادبی تجزیے" اصناف سخن کے ارتقائی سفر سے متعلق ہے۔ جبکہ اس کا کچھ حصہ شخصیات اور کتابوں کے تبصروں پر مشتمل ہے۔ قاسم جلال کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کے شعری مجموعے پاکستان بھر میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں ۔ نثر کے میدان میں بھی انہیں انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ ان کا حفیظ جالندھری سے طویل انٹرویو کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے اور اردو ادبی تاریخ کا اثاثہ ہے جس میں حفیظ جالندھری کی زندگی کے کئی گوشے منور ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ قاسم جلال کے مضامین مختلف ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ تحقیق اور تنقید ان کے مزاج کا حصہ ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ادبی

تخلیقات کو اپنے مخصوص زاویہ نظر سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔

ادبی تجزیئے قاسم جلال کے ان تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا اولیں مجموعہ ہے جس میں اصناف سخن کا تفصیلی ارتقائی جائزہ شامل ہے۔ اس سے قبل بھی اصناف شعر کا تاریخی اور تدریجی سفر مختلف کتابوں کی صورت میں شائع ہو چکا ہے لیکن اس کتاب کے مضامین میں قاسم جلال نے نہایت سادہ آسان اور عام فہم زبان میں ان اصناف کو پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند نے اپنی کتاب "تحقیق کا فن" میں تحقیق کے بارے میں لکھا ہے کہ تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے جس کے حروف ح ق ق ہیں اس کا مطلب ہے حق کو ثابت کرنا یا حق کی طرف پھیرنا' ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول تحقیق کے لغوی معنی کسی چیز یا شے کی حقیقت کا اثبات ہے اصطلاحا" یہ ایک ایسے مطالعے کا نام ہے جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔ تحقیق کے مختلف انداز ہیں جس میں تجرباتی' تاریخی' عملی' نظریاتی اور اطلاقی تحقیق شامل ہے۔ قاسم جلال نے ادبی تجزیئے میں نظریاتی' تجزیاتی اور کہیں تاثراتی تنقید کا سہارا لے کر اصناف سخن کو اپنے طرز احساس سے سجایا ہے اور ادبی تاریخی کڑیوں کو مربوط کیا ہے۔

شعر صداقت اور حسن فطرت کا دلکش اظہار ہے۔ جس کی کئی ایک پرتیں ہیں یہ غزل' نظم' قصیدے' قطعے' رباعی اور مرثیے میں اکائی کو برقرار رکھتا ہے بلکہ زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے مربوط ہوتا ہے۔ غزل میں شعر ایک مکمل موضوع کو پیش کرتا ہے۔ دو مصرعوں میں شاعر کمال مہارت سے اپنی بات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ فصاحت و بلاغت اور ابلاغ شعر کا حسن ہے۔ غم جاناں سے غم روزگار تک زندگی کے تمام اظہار اس میں مل سکتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے غزل کو بھرپور اظہار کا خوبصورت وسیلہ قرار دیا ہے۔ فارسی سے اردو زبان میں مروج ہونے والی اس صنف سخن نے شاہ جہاں' اورنگزیب سے لے کر عہد جدید تک بڑا کٹھن سفر کیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے موضوعات' اظہار کے سانچے اور لفظیاتی نظام تبدیل ہوتے رہے ہیں لیکن نامساعد حالات میں بھی غزل نے اپنی شناخت کو برقرار رکھا ہے اور عام و خاص میں مقبول رہی ہے۔

غزل کے موضوعات حسن و عشق' لب و رخسار' قدو قامت' زلف دراز اور مخمور آنکھوں سے

معمور ہیں۔ بار بار موضوعات کی تکرار نے غزل کے حسن کو ماند کیا تو ایک وقت ایسا بھی آیا جب محمد حسین آزاد' حالی اور کرنل ہالرائیڈ نے جدید نظم کو اردو میں متعارف کرانے کا عزم کیا اور انجمن پنجاب کے زیر اہتمام نئی نظم کی بنیاد ڈالی۔ گو نظم غزل کا رد عمل تھی۔ اس نئے تجربے کو ادبی دنیا میں پذیرائی ملی تو نظم نے بہت جلد اپنی جڑیں مضبوط کر لیں۔ مظاہر فطرت' موسم' تہوار' میلے ٹھیلے اور عام موضوعات اس میں اظہار پانے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی غزل کے مقابلے میں نظم زیادہ توانا نظر آتی ہے کیونکہ اس میں شاعر کے لئے اظہار کی آسانیاں موجود ہیں اور فکری تنوع' نفسیاتی و معروضی کیفیات کو نظم میں بہتر طریقے سے ڈھالا جاسکتا ہے۔ جدید نظم میں حالی سے اقبال اور فیض سے اختر جعفری تک زندگی پوری آب و تاب کے ساتھ متحرک اور رواں دواں نظر آتی ہے نظم کے ارتقائی سفر کو اس کتاب میں ایک خاص نقطہ نظر سے جانچا گیا ہے۔

اردو مرثیہ اہل بیت اور امام حسین ؓ کے ساتھ والہانہ عقیدت و احترام کا اظہار ہے۔ اس میں شاعر احتیاط کے ساتھ ایک ایک منظر کو قلم بند کرتا ہے۔ تمہید' جنگ کا منظرنامہ' جوش و جذبہ' لفظوں کی گھن گرج اور رواں بحروں کا استعمال اس کا وصف ہے۔ میرانیس اور میر دبیر سے لے کر محسن نقوی تک اردو مرثیے کے خدو خال' کس طرح سنورے' کس طرح ہیت کی تبدیلیاں اس میں در آئیں اور اس نے کیسے اردو ادب میں اپنی شناخت کو زیادہ مربوط کیا؟ ان سوالات کے جوابات مضمون "مرثیہ - ماضی و حال کے آئینے میں" تفصیل کے ساتھ دے دیئے گئے ہیں اور اس بات کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ مختلف ادوار میں کس طرح شاعروں نے اسے مخصوص لب و لہجہ عطا کیا۔ ترقی کی منزلوں تک پہنچایا اور اس کے جواز کو ادب میں ثابت کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا شاعر کربلا کی علامتوں کو شعر کا پیراہن عطا کرتا نظر آتا ہے اور یہ استعارہ شاید اردو شاعری میں ہمیشہ تابندہ رہے گا۔ قطعہ نگاری میں شاعر انتہائی چابکدستی سے چار مصرعوں میں ایک موضوع کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔ اس میں عام طور پر معروضی حالات کو پیش کیا جاتا ہے۔ صحافت سے وابستہ ہو کر رئیس امروہوی نے اردو قطعے کو ایک نیا آہنگ دیا ہے۔ انہوں نے عام انسانی جذبات کو نہایت عمدہ بندشوں سے قطعات کا روپ دیا ہے جس سے قطعہ نگاری کی تاریخ اردو ادب کا سرمایہ بن گئی ہے۔ عوامی احساسات اور جمہور کی خواہش اس میں مچلتی اور کروٹیں لیتی ہیں۔ قطعہ نگاری کی تاریخ کو بھی مختلف ادوار میں قاسم جلال نے محفوظ کر لیا ہے۔ لوک کہانی سے داستان تک اور پھر ناول سے افسانے تک کہانی نے مختلف انداز

سے سفر کیا ہے۔ افسانہ اردو نثر میں اہمیت کا حامل رہا ہے۔ ایک نشست میں پڑھی جانی والی کہانی نے اردو میں کس طرح اپنی جگہ بنائی اور کن کن لکھنے والوں نے اسے اپنے اپنے انداز میں سپرد قلم کیا قاسم جلال نے وضاحت کے ساتھ اس کی تاریخ لکھ دی ہے بلکہ علامت نگاری نے افسانے کو کس طرح متاثر کیا۔ واقعات' تاثرات' نفسیات اور استعاراتی اسلوب افسانے کی کس طرح ضرورت بنا۔ یہ سب کچھ انہوں نے اس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں رئیس امروہوی' شاہد دہلوی اور عارف رحمانی کی شخصیات کا فکری و فنی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان شخصیات کی فنی خوبیاں' کمالات اور فکری نقطہ نظراس طرح پیش کیا گیا ہے جس سے انہیں سمجھنے میں بہت آسانی ہوگئی ہے۔ بلکہ وہ بہت سے ایسے گوشے بھی ہمارے سامنے لائے ہیں جن سے ان شاعروں کی فکری اساس کو ایک نئی جہت مل گئی ہے۔

کتاب کے آخری حصے میں مختلف کتابوں کے تجزیئے اور تبصرے شامل کئے گئے ہیں۔ یوں یہ ادبی تجزیئے معنوی و صوری اعتبار سے ادبی دستاویز بن گئے ہیں۔

میک کیرو (R.B. Mckerrow) انگریزی کا ایک بہت بڑا محقق گزرا ہے اس نے تحقیقی مضمون کے پانچ حصوں کی نشاندہی کی ہے۔

۱۔ تمہید
۲۔ مسئلہ
۳۔ اس کا پھیلاؤ
۴۔ مواد کا مرتب کرنا
۵۔ خاتمہ

وہ کہتا ہے کہ ان پانچ حصوں میں سے اگر کوئی حصہ بھی کمزور ہوگا تو آپ کی تحقیقی کاوش کامیاب نہ ہوگی۔ میک کیرو کی تعریف کو ہم جب قاسم جلال کی تحریروں پر منطبق کرتے ہیں تو ایک خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے عرق ریزی سے ایک ایک نقطے کو نہایت وضاحت اور تفصیل کے ساتھ کتاب میں پیش کردیا ہے۔ یہی نہیں کہ وضاحت میں لفظیات اور جملوں کو خوامخواہ طوالت دے کر مضامین کو بوجھل کیا گیا ہو بلکہ ان کی کامیابی تو یہ ہے کہ نہایت کمال مہارت سے انہوں نے جامعیت کے ساتھ اختصار کو بھی ملحوظ رکھا

ہے اور یوں اپنے تحریر کو بوجھل' ثقیل اور غیردلچسپ ہونے سے بچالیا ہے۔

میں قاسم جلال کو ان کے اولیں تحقیقی و تنقیدی مجموعے "ادبی تجزیئے" پر خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے ادب کے طالب علموں کے لئے بیش بہا معلومات کو اکٹھا کر کے شائع کر دیا ہے۔ اس سے جہاں ادب کے طالب علموں کو فائدہ پہنچے گا وہاں عام قاری کے لئے بھی بہت سی کام کی باتیں موجود ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ وہ آئندہ بھی اس کام کو جاری رکھیں گے کیونکہ آج کل تحقیق و تنقید کے میدان میں جس کا اشارہ میں نے شروع میں بھی کیا ہے جو کمی محسوس ہو رہی ہے وہ پوری ہوگی بلکہ جنوبی پنجاب سے ایک ایسا محقق اردو ادب کی تاریخ میں اپنا آپ منوا سکے گا۔ جس کی تحریروں میں استدلال' منطقی ربط اور متن میں استعمال ہونے والے لفظ اپنائیت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ "رئیس امروہوی -- احوال و آثار" جب چھپ کر سامنے آئے گا تو دنیائے ادب کو ایک ایسا محقق میسر آ جائے گا جو اپنی ادبی خدمات کی بدولت آنے والوں کے لئے مینارہ نور ثابت ہوگا۔ انشاء اللہ

ڈاکٹر نواز کاوش
شعبہ اردو
گورنمنٹ ایس ای کالج
بہاول پور

اصنافِ سخن

اردو غزل کا آغاز و ارتقاء

صدیوں سے اردو غزل کا سفر جاری ہے ۔ یہ ہماری تہذیب کی آئینہ دار ہے اور ہماری تہذیب اس کی ترجمان ۔ " یہ ہماری شعر و شاعری کا بیش بہا سرمایہ ہے " (۱) ۔ اگرچہ اسے گاہے گاہے مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن یہ صنفِ شعر اپنے خصائص کی وجہ سے ہر دور کے عوام و خواص میں مقبول رہی ہے اور اس کی ہردلعزیزی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

"غزل کے لغوی معنی عورتوں کے متعلق بات کرنے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عورت ہمیشہ ہمیشہ سے دنیا میں انسان کی محبوب ترین چیز رہی ہے اور ہر دل و دماغ پر اس نے ہر دور میں گہرا اثر کیا ہے" (۲)۔ نقادوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق غزل کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ اردو انسائیکلوپیڈیا کے مطابق "ہرن شکاری کتوں سے زخمی ہو کر مایوسی کے عالم میں جو صدائے دردناک بلند کرتا ہے اسے غزل کہتے ہیں" (۳)۔

غزل کی ہیئت وہی ہے جس ہیئت میں قصیدہ لکھا جاتا ہے ۔ اس کا مطلع ، تخلص کا حامل مقطع، قافیہ ، ردیف ، وزن اور ہر شعر بہ اعتبارِ مضمون قصیدے کی طرح ہے ۔ غزل عربی زبان کا لفظ ہے ۔ "عرب کی کل کائنات رَجَز ، حدی ، ابیات ، قصیدہ اور مرثیہ تھا" (۴) ۔ پروفیسر حمید احمد خاں کے خیال میں اردو

غزل نے قصیدے سے ہی جنم لیا ہے ۔ وہ عربی قصیدے کے حوالے سے غزل کا پس منظر واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جاہلیت کے بڑے شعرا کے ظہور کے وقت عربی شعر کی سب سے زیادہ منجھی ہوئی اور مقبولِ عام شکل قصیدہ تھی ۔ بلحاظِ مضمون قصیدے کے دو حصے خصوصیت سے نمایاں تھے ، نسیب اور مدح ۔ نسیب ، عربی قصیدے کی اس عشقیہ تمہید کا نام تھا جس میں شاعر اپنے کوائفِ عشق سناتا اور اپنے جوشِ محبت اور آلامِ فراق کا ذکر کرتا ہے ۔ یہی قصیدہ فتحِ ایران کے بعد اہلِ ایران کے حصے میں بھی آیا۔ ایران کے جوہر شناسوں نے قصیدے کی صورت (من حیثِ صورت) بہت جلد پسند کر لی اور پھر غزل کی زمین میں اسی ہیئت شعری پر صدیوں تک اپنی شاعرانہ کاوشوں کو صرف کیا... اس طرح غزل اپنی اصل کے لحاظ سے قصیدے کی ہیئت میں عورتوں کا ذکر اور ان کے عشق کا بیان ہے ۔ غزل کا یہ تصوّر بداہتاً عربی قصیدے کے اس حصے سے ماخوذ ہے جسے نسیب کا نام دیا جاتا ہے (۵)۔ نسیب کو فارسی میں تشبیب کہتے ہیں ۔

نویں صدی عیسوی میں فارسی غزل گوئی کا آغاز ہوا۔ دسویں صدی کے نصف اوّل میں فارسی کے صاحبِ دیوان غزل گو رودکی نے قصیدے کی تشبیب کے عشقیہ اشعار کو الگ کر کے اسے ایک صنفِ شعر کے طور پر متعارف کرایا۔ اسی صنفِ شعر کو غزل کہتے ہیں ۔

پروفیسر حمید احمد خاں فارسی غزل کا عہد بہ عہد ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بارھویں اور تیرھویں صدی میں سنائی ' عطار اور رومی نے غزل کی عاشقانہ بات چیت کو تصوّف کے نئے کیف سے آشنا کیا۔ یہ ایک بڑا ترقی پسندانہ قدم تھا جس کے لیے رائج الوقت غزل کی زمین تیار نہ تھی۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ خودسنائی کی غزل میں ایک قسم کی غرابت محسوس ہوتی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ واضح یہ واقعہ ہے کہ گیارھویں صدی میں جب فارسی کے پہلے بڑے صوفی شاعر شیخ ابو سعید ابوالخیر کو کسی موزوں شعری ہیئت کی ضرورت پڑی تو انہوں نے غزل کو نہیں چھیڑا۔ رباعی کو اختیار کیا۔ غزل میں تصوّف کی آمیزش سو برس بعد سنائی کے حصّے میں آئی۔ پھر سعدی کی سلاست نے اس نئی غزل کو قبول عام تک پہنچایااور حافظ کے سرودالحان نے چار دانگِ عالم میں ایک گونج پیدا کر دی۔ دو صدیاں اور گزریں تو صفوی عہد کے شعراء نے فلسفہ و نفسیات کے مضامین بڑی خوبی سے غزل میں بیان کیے۔ سترھویں صدی میں بعض خیال بند شعراء نے (جن کے سرخیل مرزا عبدالقادر بیدل ہیں) عشق سے روگردانی کر کے علومِ عقلیہ کو بڑی شدّومد سے غزل کا موضوع قرار دیا"۔ (۶)

اردو متغزلین کے سامنے فارسی غزل کی روایات کے رنگارنگ نمونے موجود تھے۔ چنانچہ انہوں ان روایات کو اردو غزل میں سمویا اور اپنی تہذیب و معاشرت کے نقوش ابھار کیے۔

دردمندی و دل سوزی غزل کی روایت کے بنیادی عناصر ہیں۔ ان کی موجودگی کلام کی تاثیر کو دو آتشہ کر دیتی ہے۔ پرسوز غزل کے اشعار سنتے ہیں دل میں اتر جاتے ہیں۔

بقولِ حسرت موہانی:

شعر دراصل ہیں وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

بقولِ شان الحق حقی "اچھا شعر شرح سے بے نیاز ہوتا ہے خصوصاً غزل کا شعر کہ اس میں بات فورادل تک نہ پہنچے تو تاثیر آدھی رہ جاتی ہے" (۷)۔ لیکن دوسرے کے دل تک اپنی بات پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ دل سے نکلی ہو یعنی خلوص دل سے کہی گئی ہو۔ "ایک شاعر عام انسانوں سے مختلف اور برتر ہوتا ہے۔اس کی یہ برتری دلِ گداختہ کے طفیل ہوتی ہے۔اس سے شاعری یا دردِ مجبوری نمودار ہوتا ہے"۔ (۸)

غزل نے ہر دور کے تقاضوں کا ساتھ دیا ہے۔ اس کے دامن میں ہمہ نوع تجربات و روایات موجود ہیں۔ ان روایات میں فلسفیانہ گہرائیاں بھی ہیں اور سماجی رویّوں کا عکس بھی۔ تاریخی واقعات بھی ہیں اور بحرانی حالات کا مدّوجزر بھی۔ "وہ حسن و عشق ہو یا تصوّف' بہار و خزاں ہو یا زندان و صحرا' حیات و اخلاقیات ہو یا نفسیات کے بے شمار پہلو' سب غزل کے موضوع میں داخل ہیں" (۹)۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

"اردو ادب میں داخلی شاعری کی بہترین مثال غزل ہے جو شاعر کی دروں بینی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ غزل میں شاعر مختلف وارداتِ قلبیہ نظم کرتا ہے۔ خوشی' غم' وصل' ہجر کی کیفیات دکھاتا ہے۔ حسنِ محبوب دیکھ کر اس کے دل میں جو احساسات بیدار ہوتے ہیں 'ان کی سچی تصویریں کھینچتا ہے۔ اس کے علاوہ اخلاق' تصوّف اور فلسفے کی گتھیاں بھی سلجھاتا ہے۔ لیکن یہ ساری گفتگو وہ رمز و کنایہ میں کرتا ہے۔ اشارات اور رمزیت غزل کی جان ہے۔ یہی چیز غزل کی شاعری میں تاثیر پیدا کرتی ہے"۔ (۱۰)

غزل کبھی ہمیں جلوہ گاہِ ذات کی سیر کراتی ہے ، کبھی جمالِ محبوب کی طرف متوجہ کرتی ہے ۔ کبھی مسائلِ حیات سے آگاہ کرتی ہے اور کبھی ہماری قوتِ متخیلہ کو ان دیکھی دنیاؤں کی طرف جست لگانے پر مائل کرتی ہے ۔ اس سارے عمل کے دوران میں اگرچہ وہ تمام عناصرِ حیات و کائنات کا جزوی تجزیہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن درحقیقت اس کی تنقید و تحلیل ، بکھرے ہوئے اجزاء کو سمیٹنے اور ان کی اصل شناخت اجاگر کرنے کی ایک کوشش ہوتی ہے ۔ " غزل کی امتیازی خصوصیت تحلیلی مطالعہ نہیں بلکہ اجتماعی محاکمہ ہے اور اس ضمن میں غزل نے جس انداز سے شعر کے مختصر سے پیمانے میں بڑے بڑے مطالب کو سمیٹا ہے ، شاعری کی کسی اور صنف کے بس کا روگ نہیں "۔ (۱۱)

غزل کے میدان میں تقریباً ہر بڑے ، چھوٹے شاعر نے طبع آزمائی کی ہے ۔ ان شعراء کی فہرست بہت طویل ہے ۔ چند ایسے شعراء کے کلام کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے جو شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے اور جن کی وجہ سے غزل اردو شاعری کا سرمایۂ افتخار بن گئی ۔

امیر خسرو نے سب سے پہلے اردو غزل گوئی کا آغاز کیا۔ ان کے بعض مصرعوں کا نصف حصہ ہندی اور نصف حصہ فارسی میں ہے ۔

محمد قلی قطب شاہ ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ انہیں اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تسلیم کیا گیا ہے ۔ ان کی غزلوں پر فارسی کے اثرات کم ہیں اور ہندی کا رنگ زیادہ غالب ہے ۔

حقیقت میں ولی کے ہاتھوں ہی اردو غزل کی باقاعدہ بنیاد پڑی ۔ ان کا کلام فارسی اور ہندی روایات کا ایک حسین سنگم ہے ۔ انہوں نے ان روایات کی پابندی تقلیدی انداز میں نہیں کی بلکہ اپنی انفرادیتِ طبع کو بھی نمایاں رکھا ہے ۔ محمد حسین آزاد ولی کی غزل گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

" ولی نے اسے وہ زور بخشا کہ آج ہندی شاعری (اردو شاعری) نظم فارسی سے ایک قدم پیچھے نہیں ۔ تمام بحریں فارسی کی ، اردو میں لائے ۔ شعر کو غزل اور قافیے کو ردیف سے سجایا۔ ردیف وار دیوان

بنایا۔ اردو زبان اس وقت سوائے ہندی دوہروں اور بھاشا کے مضامین کے اور کسی قابل نہ تھی ۔ انہوں نے اس میں فارسی ترکیبیں اور فارسی مضامین کو داخل کیا"۔ (۱۲)

ولی نے سادہ و فصیح انداز میں معاملاتِ حسن و عشق اور صوفیانہ افکار کو غزل کے سانچے میں ڈھالا۔ ان کی غزل کے موضوعات میں گہرا سماجی شعور نظر آتا ہے ۔ ولی نے جدید تشبیہات و استعارات سے کلام کو مزین کیا اور شگفتہ و شیریں اسلوب اپنا کر اردو غزل کو نکھارنے اور سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا۔

میر تقی میر نے اردو غزل کو نئی روایات سے شناسا کر کے ایک خاص معیار عطا کیا۔ ان سے پہلے غزل مشکل پسندی و صنعت گری تک محدود تھی ۔ میر نے سادہ اسلوب اختیار کر کے غزل کو مقبولِ عوام و خاص کر دیا۔ سوزوگداز ، طنز ، ندرتِ ادا اور نزاکتِ زبان کلامِ میر کے وہ بنیادی اوصاف ہیں جن کی وجہ سے میر کو شہرت دوام حاصل ہوئی ۔

میر کی غزل کی ایک خاص پہچان ان کی غم پسندی ہے ۔ وہ چونکہ عمر بھر مصائب و مشکلات کا شکار رہے اس لیے ان کا کلام درد و غم کا ترجمان نظر آتا ہے ۔ "میر کا کلام ان کی اپنی زندگی اور عوام کی دکھی ہوئی زندگی کا نچوڑ ہے "۔ (۱۳)

میر نے غم انگیز داخلی کیفیات کے ساتھ اپنے زمانے کی سیاست و معاشرت کے نقوش واضح کیے ۔ ذات کے غم کے ساتھ سیاسی انتشار اور سماجی خلفشار میر کو خون کے آنسو رلاتا تھا۔ ان کے بارے میں شیفتہ کی یہ رائے مبنی بر حقیقت ہے ۔ " صد آہِ دردناک بہ تاثیر یک مصرع او نیست "۔ (۱۴)

میر کی غم پسندی و دردمندی کے پسِ پردہ عوامل کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

" میر کی دردمندی کے سرچشمے ان کے خاندانی ماحول سے پھوٹتے ہیں۔ چچا کا جنون اور والد کی مجذوبانہ سیرت ، ان کا صوفیانہ طرزِ زندگی اور صبح و شام کی بے خودی اور استغراق ۔ یہ موروثی موثرات ہیں ۔ بے وقت

یتیمی ' اعزّہ کی بے مہری ' زمانے کی جفاکاری ' بے روزگاری' فاقہ کشی '
دربدری' خاک بسری اور دوسرے مصائب و آلام نے میر کے ذہن کو
تقریباً ماؤف کر دیا تھا۔ زمانے نے میر کو قدم قدم پر ناقص ہونے ' بے
کس ہونے اور غیر مکمل ہونے کا احساس دلایا"۔ (۱۵)

درجِ ذیل شعر سے میر کے کلام کے محرکّات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

سودا بھی میر کے ہم عصر تھے ۔ انہوں نے میر کی طرح جس دور میں آنکھ کھولی ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ سیاسی و معاشی لحاظ سے افراتفری کا عالم تھا ۔ وابستگانِ اقتدار زوال کا شکار ہو کر مرقعِ عبرت بن گئے تھے ۔ امن و سکون خواب و خیال ہو کر رہ گئے تھے ۔ سودا جن امیروں کے زیرِ سایہ زندگی بسر کر رہے تھے انہیں کبھی سیاسی استحکام نہ مل سکا۔ ان حالات میں سودا کے دل پر کیا گزری ہو گی ۔ ان کا درجِ ذیل شعر ان کے حالِ دل کا ترجمان ہے ۔

تم کو معلوم ہے یارو ! چمنِ قدرت میں
عمر گزری کہ ہے گردش سے سروکار مجھے

سودا کی زندگی کے نقوش ان کے کلام سے نمایاں ہیں ۔ بقول شیخ چاند:

" جب ہم سودا کی غزلوں میں اس کی حیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس
کے اندرونی رخ کا نقشہ دکھائی دیتا ہے ۔ گو اس نے غزل کے مضامین میں
بیرونی اور خارجی عناصر بھی داخل کر دیے ہیں ۔ لیکن اس سے اس کی حیات
کی ترجمانی کا دروازہ بند نہیں ہوا ۔ ہمیں اس کے دل و دماغ کی آواز متنوع
مضامین و موضوعات کے ہجوم میں بھی صاف سنائی دیتی ہے "۔ (۱۶)

میر اور سودا اگرچہ ایک ہی دور کے ہیں لیکن چونکہ دونوں کی طبائع مختلف تھیں اس لیے ان کے اخذ و قبول اور احساس و ادراک کے پیمانے بھی مختلف ہیں ۔ سودا کی غزلوں میں زندگی کا تنوّع اور رنگارنگی نظر آتی ہے ۔ وہ میر کی طرح صرف بے ثباتیٔ دنیا' غم' ہجر' سوز و گداز' اور حسرت و یاس ہی کی بات نہیں کرتے بلکہ زندگی کی بدہیئتی کے ساتھ اس کے روشن اور شگفتہ پہلوؤں کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں ۔ ان کے موضوعات کی ہمہ گیری اور وسعت نے انہیں منفرد مقام عطا کیا ہے ۔

ڈاکٹر اعجاز حسین ان کے موضوعات و اسلوب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

" سودا کے شعر میں بندش نہایت چست ہے ۔ معنویت اور درد کا
حصہ بھی کم نہیں ہے ۔ تاثیر جسکی چاشنی اردو غزل کے لیے ضروری
سمجھی گئی ہے اس میں بھی سودا نہایت ممتاز رتبہ رکھتے ہیں اور ان
کے یہاں تشبیہ اور استعارے کبھی کبھی ایسی چیزوں سے پیدا کیے
جاتے ہیں جو خاص لطف دے جاتے ہیں "۔ (۱۷)

میر درد نے مسائلِ تصوّف پیش کر کے اردو غزل کو فلسفیانہ رجحانات سے روشناس کیا ۔ وہ چونکہ خود صوفیٔ صافی تھے اور ان کی زندگی تصوّف و معرفت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی اس لیے ان کی غزل میں ان کے خلوصِ دل کی تاثیر نظر آتی ہے ۔

درد کی غزل کے موضوعات میں دنیا کی بے ثباتی' انسان کی فانی حیثیت' مقاصدِ حیات' فکرِ آخرت اور مسائلِ زندگی خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے تصوّف اور سماجی حقائق کو جس سادگی و پرکاری سے تغزّل کے سانچے میں ڈھالا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ درد کی غزل گوئی کے بارے میں صفی مرتضیٰ لکھتے ہیں:

"درد کی شاعری میں صوفیانہ خیالات کی نمائندگی پائی جاتی ہے ۔ جسکی
وجہ سے وہ دوسرے غزل گو شعراء سے ممتاز ہو گئے ہیں ۔ ان کا
لب و لہجہ ' ان کا انداز بیاں ' ان کی دھیمی آواز دوسرے شعراء سے

مختلف ہے ۔ دلّی کے سماجی حالات اور اپنے عصر کے احساسات کی
تصویریں بھی ان کے کلام میں ملتی ہیں "۔ (۱۸)

درد کی غزل میں حقیقی عشق کے ساتھ مجازی عشق کو بھی موضوع بنایا گیا ہے ۔ نسوانی حسن کی تصویر کشی کرتے ہوئے انہوں نے غزل کے اسی انداز کو پیشِ نظر رکھا ہے جو اس وقت دوسرے شعراء کے ہاں مروّج تھا۔

"جس طرح درد کے متصوّفانہ اشعار کو سامنے رکھ کر ان کو صوفی شاعر قرار دیا گیا ہے اسی طرح ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ عشقِ مجازی کے ذائقے سے بھی بخوبی واقف تھے ۔

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

دل کس کی چشمِ مست کا سرشار ہو گیا
کس کی نظر لگی کہ یہ بیمار ہو گیا

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا " (۱۹)

"معاملہ بندی" انشاء ، جرائت اور رنگین کے کلام میں روحِ رواں کی حیثیت رکھتی ہے ۔ ان دونوں شعراء نے مسلسل غزلوں کے حوالے سے نام پیدا کیا ہے ۔ ان کے کلام میں شوخی ، بانکپن ، خودرفتگی ، خواہش پرستی ، ابتذال ، رندی اور سرمستی پائی جاتی ہے ۔ بقول سیّد اعجاز حسین:

" جرات و انشاء کی وجہ سے غزل کے رجحان میں یہ تبدیلی ہوئی کہ
بجائے متانت و بلندیٔ تخیّل کے چھیڑ چھاڑ اور شوخی زیادہ آگئی ۔

قنوطیت کم ہوئی ۔ مگر کیف و دیرپا اثر کو صدمہ پہنچا۔ زبان و مذاق کی
بلند ہوتی ہوئی سطح کو کسی قدر نیچے آنا پڑا"۔ (۲۰)

کسی دانشور نے کہا ہے کہ کلام شاعر کی شخصیت کا ترجمان ہوتا ہے ۔ اردو کے معروف غزل گو شاعر خواجہ حیدر علی آتش کے حوالے سے یہ مقولہ سو فیصد درست لگتا ہے ۔ آتش کی تصوّف سے دل بستگی صرف شاعری کی حد تک نہ تھی بلکہ ان کا اندازِ زندگی ، رجحانِ طبع ، عقائد اور افکار تصوّف و معرفت کا آئینہ تھے ۔ ان کی پوری زندگی قناعت ، سادگی اور درویشی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی ۔

زبان کی صفائی ، رنگینی ، شوخی اور حلاوت نے ان کی غزل کو امتیازی خصوصیات عطا کیں اور ان کا اردو کے بہترین شعراء میں شمار ہوا۔

احتشام حسین ، آتش کی غزل کے موضوعات کے بارے میں لکھتے ہیں:

" آتش کے صوفیانہ تصورات کی نمود سب سے زیادہ تو ان کی آزادگی پسندی ، تصفیۂ قلب اور روحانی سرمستی میں ہوتی ہے جس سے ان کی شاعری بھری پڑی ہے لیکن تصوّف کے وہ مقامات بھی ان کے یہاں آتے ہیں جن کا تعلق معرفتِ نفس ، فنائے خودی ، ترکِ دنیا ، وحدتِ وجود ، مجاز و حقیقت ، جبر و اختیار ، انسانی ہستی کی بے ثباتی ، عظمتِ ترکِ رسوم اور خدا کے متعلق شوخیٔ تخیّل سے ہے ۔ یہی وہ کسوٹیاں ہیں جن پر آتش کا تصوّف پرکھا جا سکتا ہے اور انہیں اہم مسائل کی تشریح اور توضیح سے تصوّف کی حدود متعیّن کی جا سکتی ہیں "۔ (۲۱)

مرزا اسداللہ خاں غالب اپنے عہد کے بہت بڑے شاعر ہیں ۔ ان کی غزل میں معاملاتِ حسن و عشق بھی ہیں ، مسائلِ تصوّف بھی ہیں اور حیات و کائنات کے پُراسرار حقائق بھی ۔ خصوصاً ان کے کلام میں ان کے عہد کے ذہنی و جذباتی رویّے بہ تمام و کمال موجود نظر آتے ہیں ۔ "غالب ایسے دور میں پیدا

ہوئے جب ایک تہذیب کے نقوش آہستہ آہستہ دھندلا رہے تھے اور دوسری تہذیب انہی دھندلکوں میں اپنے قدم جما رہی تھی۔ غالب نے اسی کشمکش اور انتشار کا مطالعہ بڑی سنجیدگی اور نہایت دوراندیشی سے کیا اور اس سے بہت کچھ حاصل کیا"۔ (۲۲)

غالب کی غزل کو سیاسی و تہذیبی پس منظر میں دیکھیں تو اس میں مغلیہ سلطنت کے زوال کی تصویر بھی نظر آتی ہے اور داخلی انتشار و اضطراب کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ انہوں نے غمِ جاناں و غمِ دوراں کی فلسفیانہ توجیہ کر کے غزل کو جدید و مجتہدانہ رنگ عطا کیا۔ وہ منزلِ شوق کے ایسے مسافر ہیں جو حقائق کو کشادہ دلی سے تسلیم کرتا ہے۔ اور کسی خوش فہمی و خود فریبی کا شکار نہیں۔ اس مسافر کو منزل ملے یا نہ ملے وہ اپنا سفر بڑے عزم اور ولولے سے جاری رکھتا ہے۔ شبیہ الحسن اس سفر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"غالب کے ذوقِ سفر میں فرزانگی بھی ہے اور دیوانگی بھی۔ اسی لیے نہ وہ منزل پر پہنچتے اور نہ پیچھے لوٹتے ہیں۔ انہیں وہ یک گونہ بے خودی حاصل ہو گئی تھی جس کی وجہ سے وہ اسی رہِ وادیِ خیال کو مستانہ طے کر سکتے تھے جس میں نہ منزل آتی ہے اور نہ پسپائی ہوتی ہے۔

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدّعا مجھے (۲۳)

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ غالب کی کوئی منزل مقصود نہیں یا وہ بے سمتی کا شکار ہیں۔ حیات و کائنات کے بارے میں ان کا ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے۔ اس سلسلے میں ان کے اپنے تجربات و مشاہدات ان کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ وہ روایت کو جدّت اور تغزل کو تفکر سے ہم آہنگ کر کے ایک ایسی فضا تخلیق کرتے ہیں جس میں حکیمانہ فکر اور سماجی شعور پرورش پاتا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے قول کے مطابق:

"غالب نے اردو غزل کو ایک نیا شعور، ایک نیا نسب اور ایک نیا افق دیا۔ غالب کے تصرّف سے غزل اردو کی تاثیر اور تقدیر بن گئی"۔ (۲۴)

پیام شاہجہاں پوری غالب کی ندرتِ فکر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"غالب اردو زبان کا عظیم شاعر تھا، جس نے عام راستے اور رجحان سے ہٹ کر اپنے لیے ایک نیا جادہ بنایا۔ اردو کو نئے نئے اسلوب دیے۔ خیالات کو رفعت بخشی اور اچھوتے مضامین داخل کر کے اردو شاعری کے سرمائے میں قابلِ قدر اضافہ کیا"۔ (۲۵)

غالب ہی کے دور کے ایک اہم شاعر مومن خاں مومن ہیں جن کا اردو غزل میں ایک ممتاز مقام ہے۔ دیگر شعراء کی طرح ان کی غزلوں میں مضامین کا تنوّع موجود نہیں۔ تصوّف، فلسفے اور تہذیبی مظاہر سے انہیں کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ ان کی غزل کا زیادہ تر موضوع مجازی عشق ہے۔ انہوں نے معاملاتِ حسن و عشق کے حوالے سے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کو دلکش اور رنگارنگ اسلوب میں پیش کیا ہے۔ ان کا محبوب روایتی محبوب کی طرح کوئی آسمانی مخلوق نہیں بلکہ اسی دنیا کا گوشت پوست کا انسان ہے۔ تغزّل اور احساسِ جمال نے ان کی غزل میں طلسمی جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی مومن کی غزل کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حسن کی رنگینیوں اور ہجرووصال کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے مومن نے انسانی شعور اور حقیقت پسندانہ زاویۂ نظر سے کام لیا ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں نہ تو عشق کی خستگی کا تذکرہ حد سے زیادہ ملتا ہے اور نہ لذت اور تعیش کی باتیں حد سے تجاوز کرتی ہوئی نظر آتی ہیں"۔ (۲۶)

بہادر شاہ ظفر کی غزلوں کے موضوعات متنوع ہیں ۔ اگرچہ ان کے کلام میں رطب و یابس بھی بہت ہے لیکن بہت سی غزلوں میں اردو شاعری کی پختہ روایات کا عکس نظر آتا ہے ۔ ان کے کلام میں اگرچہ سیاسی ، تہذیبی اور عمرانی مضامین بھی ملتے ہیں لیکن بنیادی طور پر حسن و عشق کی کیفیات کی ترجمانی ہی ان کی شناخت ہے ۔ ظفر کی زندگی چونکہ الم انگیز واقعات سے معمور ہے اس لیے انہوں نے اپنی ذہنی و جذباتی کیفیات کو غزل کا روپ دیا جس سے کلام میں تاثیر کا جوہر پیدا ہوا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ظفر کی غزل کا جائزہ ان الفاظ میں لیا ہے:

> " ظفر لفظوں کو سلیقے سے استعمال کرتا ہے جس سے اندازِ بیاں میں گھلاوٹ ، معصومیت اور دھیماپن پیدا ہو جاتا ہے ۔ اس کے لہجے میں بڑے ضبط اور توازن کا احساس ہوتا ہے۔۔۔غم کی لیک اور لہجے کی کھنک اس کی ہر غزل میں ایک فضا پیدا کر دیتی ہے ، جس سے احساس و ادراک ایک رشتے میں پیوست ہو جاتے ہیں اور غزلیں تسلسلِ فکر و فضا کا احساس پیدا کرنے لگتی ہیں ۔ زندگی کا تضاد ، ماضی کی یادیں ، لاشعور کا کرب ، غمِ زمانہ ، ذہنی بے چارگی ۔ یہ اور بہت سے احساس پہاڑوں کے توازن کی طرح اسکی غزلوں میں نظر آتے ہیں ۔ اس کے احساس کا بھولا پن ، اس کی خودداری اور پاسِ آبرو قدم قدم پر دلوں کو موہ لیتے ہیں "۔ (۲۷)

نواب مرزا خاں داغ اگرچہ مومن ، بہادر شاہ ظفر ، غالب اور ذوق کی آنکھیں دیکھ چکے تھے لیکن انہوں نے اردو غزل کی تمام روایات سے استفادہ کیا اور اپنا ایک مخصوص رنگ بنانے میں کامیاب ہو گئے ۔ اس رنگ میں بیک وقت دہلی اور لکھنؤ کی شعری خصوصیات موجود ہیں ۔ عشق کا جنسی و جسمانی تصوّر ان کی غزل کا اساسی جزو ہے ۔ اسی لیے ان کے کلام میں شوخی و عریانی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے ۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی

نظر میں : " عشق و عاشقی ان کے لیے ایک سنجیدہ ، متین یا مہذب طرزِ عمل نہیں بلکہ کھل کھیلنے اور چسکے کی چیز ہے ۔ انھیں نہ احترامِ عشق ہے اور نہ پاسِ محبوب "۔ (۲۸)

اختر اورینوی ، داغ کی غزل کے اسلوب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> " داغ کی غزل کے لب و لہجہ میں جوش ، تازگی ، چہک اور لہک پائی جاتی ہے ۔ اس کی خوش گفتاری میں ظرافت کے مختلف رنگ ملتے ہیں ۔ مزاح ، طنز ، طعنہ ، چٹکی ، گدگدی ، پھبتی کے رنگ ۔ داغ کے یہاں عشق بازی کی رنگینی ، مستی اور انبساط ہے ۔ اس کی رندانہ شوخی کی ترنگ مزے دار ہوتی ہے ۔ داغ کی زباندانی اس کے لب و لہجہ میں تنوع اور پختگی پیدا کرتی ہے ۔ وہ بڑی نفاست سے بیان کی نوک پلک درست کرتا ہے ۔ محاوروں کا استعمال بڑے سلیقے اور قرینے کا ہوتا ہے ۔ وہ بڑا فقرہ باز اور شیوہ بیاں ہے "۔ (۲۹)

الطاف حسین حالی نے اگرچہ ابتدائی دور میں غزل کے روایتی انداز میں غزلیں لکھی تھیں لیکن انہوں نے جلد ہی یہ محسوس کر لیا کہ ایسی شاعری ملک و قوم کے لیے کسی صورت بھی سودمند نہیں ۔ بلکہ یہ قوم کے اخلاق بگاڑنے کا باعث بن رہی ہے ۔ چنانچہ انہوں نے غزل کے فرسودہ و پامال راستوں پر چلنے کی بجائے نئی منزلوں کی طرف پیش قدمی کی ۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

> " حالی نے غزل کی خراب حالت کو محسوس کیا ۔ غزل ایک خاص ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے مبتذل ، مخربِ اخلاق اور اصلیت و حقیقت سے دور ہو گئی تھی ۔ انہوں نے اس کو چھچھورے جذبات اور لایعنی احساسات سے دور رکھنے کی طرف توجہ دلائی "۔ (۳۰)

حالی نے غزل کو نئی راہوں سے آشنا کیا ۔ انہیں قوم کی زبوں حالی کا شدّت سے احساس تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ قوم خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر ترقّی کی شاہراہوں پر گامزن ہو ۔ انہوں نے غزل میں وہ موضوعات پیش کیے جو ملّی تقاضوں سے ہم آہنگ تھے ۔ اس طرح غزل مضامین کے اعتبار سے وسعتوں سے ہم کنار ہوئی ۔ " انہوں نے غزلوں میں سادہ الفاظ میں حکیمانہ نکات ' آفاق و انفس پر سنجیدہ تبصرے ' عشق کے پاکیزہ جذبات و تاثّرات اور ملّی فلاح جیسے اہم مضامین داخل کیے "۔ (۳۱)

حالی نے غزل کو نئے دور کے قومی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی روایت قائم کی ۔ اکبر چکبست اور اقبال نے اس روایت کو ترقی دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ۔ اکبر الٰہ آبادی کی غزلوں میں تصوّف کے مسائل ' تہذیبی و سماجی حالات اور حسن و عشق کے معاملات کو موضوع بنایا گیا ہے ۔

اگرچہ وہ غزل کے بہت بڑے شاعر نہیں سمجھے جاتے لیکن انہوں نے طنزیہ و مزاحیہ انداز میں زندگی کے بنیادی معاملات پیش کر کے غزل کے دائرے کو وسیع کر دیا ہے ۔ ان کے موضوعات و اسلوب سے جدّت و شگفتگی نمایاں ہے جو ان کی انفرادیت کا ایک بڑا ثبوت ہے ۔

تغزّل اور سوز و گداز غزل کی روح ہیں ۔ اکبر کی غزلوں میں یہ عناصر بھی نمایاں نظر آتے ہیں ۔

" تغزّل کا چسکا اکبر کو آخر تک باقی رہا لیکن ابتدائی زمانے کے عاشقانہ جذبات بعد میں متصوّفانہ خیالات میں تبدیل ہو گئے تھے ...اکبر کی غزل رفتہ رفتہ اخلاق ' معرفت ' فلسفہ اور سیاست کے مسائل کی حامل ہوتی گئی ظرافت اور خوش مذاقی جو اکبر کی شاعری کا نمایاں وصف ہے غزل میں بھی موجود ہے "۔ (۳۲)

حسرت موہانی نے غزل کی روایت کو چار چاند لگا دیے ہیں ۔ ان کی غزل کے موضوعات مجازی عشق اور اس کی مختلف کیفیّات پر مبنی ہیں ۔ ان کی غزلوں میں شگفتگی ' بے باکی اور دلکشی زیادہ ہے اور سوز و گداز کا عنصر بہت کم ہے ۔ وہ احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے صداقت و واقعیت کو ملحوظ رکھتے ہیں اور انسانی نفسیات کی اصلی اور صحیح تصویریں پیش کرتے ہیں ۔ انہوں نے غزل میں زندگی کے الم انگیز حقائق پیش کرنے کی بجائے اس کے نشاطیہ پہلوؤں کو زیادہ اجاگر کیا ہے ۔ اس کے ساتھ انہوں نے اپنے

کلام میں تہذیب و معاشرت اور سماجی اقدار کی بھی خوب عکّاسی کی ہے ۔ " حسرت کی شاعری میں صداقت ' توانائی ' جذبات نگاری اور سادگیٔ مزاج کی وجہ سے اندازِ بیاں کی جو خصوصیّتیں پیدا ہوئی ہیں وہ فلسفہ و فکر کی گہرائیوں سے محروم ہونے کے باوجود زندہ ' پائندہ اور حسین ہیں اور چند موضوعات میں محدود ہوتے ہوئے بھی تغزّل سے مالا مال ہیں "۔ (۳۳)

اقبال اس دور کے وہ عظیم شاعر ہیں جنہوں نے قدیم موضوعات ترک کر کے غزل کو جدّت کے سانچے میں ڈھالا ہے ۔ انہوں نہ صرف قومی و عصری مسائل کی ترجمانی کی ہے بلکہ نئی علامتیں اور اشارات وضع کر کے غزل کے دامن کو وسیع کر دیا ہے ۔ " اقبال محض شاعرانہ جذبے کی تسکین کے لیے تفریحاً شعر نہیں کہتے بلکہ ان کے پیشِ نظر ایک مخصوص اندازِ فکر' ایک متعیّن عقیدہ اور ایک مربوط نظامِ حیات ہے ۔ اور انہیں شعر کی افادی قدروں کا گہرا شعور ہے "۔ (۳۴)

اقبال کی غزلیں تفکّر ' شعریت اور اعلیٰ قومی و ملّی مضامین کی وجہ سے غزل گوئی کی تاریخ میں ایک ایسا تجربہ ہیں جو اس سے پہلے کسی شاعر نے اس جامع اور بھرپور انداز سے نہیں کیا ۔ " بال جبریل کی غزلیں لب و لہجہ ' رنگ و آہنگ ' نئی زمینوں ' نئے قافیوں اور نئے مضامین ' جدّتِ تشبیہ و استعارہ ' نُدرتِ خیال ' اسلوب کی تازگی اور طرزِ ادا کی طرفگی کے لحاظ سے تکمیلِ فن کا نادر نمونہ ہیں "۔ (۳۵)

اسلوب اور موضوعات نئے ہونے کے باوجود اقبال کی غزلوں میں وہ تمام فنّی خصوصیات موجود ہیں جو اچھی غزلوں کا طرّۂ امتیاز ہوتی ہیں ۔

اصغر گونڈوی تصوّف کے حوالے سے اردو شاعری میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں ۔ ان کے یہاں موضوعات کے تنوّع کی بجائے عشقِ حقیقی کی متنوّع کیفیات ملتی ہیں ۔ تخیّل کی سحر کاری ' رفعتِ مضامین اور بلند آہنگی اصغر کی غزلوں کے نمایاں اوصاف ہیں ۔ انہوں نے روحانی و وجدانی خیالات کی مرقّع کشی کے لیے جو دل آویز اسلوب اختیار کیا ہے ' وہ پوری اردو شاعری میں اور کہیں نظر نہیں آتا۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ان کی غزلوں کی خصوصیات کے بارے میں لکھتے ہیں:

" اصغر کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کے کلام کی
پاکیزگی اور لطافت ہے ۔ اس میں تصوّف کے مضامین بھی ہیں لیکن
اصغر نے ان کو ندرت اور تازگی کا پیرہن بخشا ہے ۔ تصوّف کے ان
مضامین میں تصوّف کی عام افسردگی ' پژمردگی ' اضمحلال اور یاس و
حسرت کی جگہ رقص 'کیف اور وجد کی کیفیت پائی جاتی ہے ۔ اس
کلام کو پڑھ کر انشراحِ قلب و روح ہوتا ہے اور دنیا سے گریز و فرار
کی جگہ یہاں شرافت اور پاکبازی سے زندگی گزارنے کو جی چاہتا ہے ۔
اصغر کی غزلوں میں الفاظ کا دروبست ایسا ہے کہ اس سے ایک پرکیف
نغمے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس میں طوفانی لب و لہجہ کی جگہ نرم و
سبک رو چشموں کا ترنم ملتا ہے "۔ (۳۶)

جگر مراد آبادی کی غزل معاملہ بندی' سراپا نگاری تکرارِ الفاظ 'شوخی اور نفسیاتی کیفیات کی عکاسی کے حوالے سے خاصی معروف ہے ۔ سادگی ' روانی اور فارسی تراکیب کا برموقع استعمال جگر کی فنِ شعر میں مشّاقی و مہارت کی دلیل ہے ۔ ان کی زبان صاف ' شستہ اور بامحاورہ ہے ۔ تغزّل کا وصف ان کی غزل کا زیور ہے ۔ عشق و محبت کے علاوہ زندگی کے دیگر حقائق و معارف نے بھی ان کے کلام میں تاثیر اور معنویت پیدا کی ہے ۔

فانی بدایونی کے کلام میں بھی میر تقی میر کی طرح رنج و غم ' یاس و محرومی اور مصائب و مشکلات کی عکاسی کی گئی ہے ۔ اسی لیے انھیں یاسیت کا امام کہا جاتا ہے ۔ فانی کی غم پسندی کے پس منظر میں غمِ عشق بھی ہے اور غمِ دوراں بھی ۔ صعوباتِ زمانہ نے جب انھیں دنیا سے دل برداشتہ کر دیا تو ان کی حزنیہ شاعری وجود میں آئی ۔ ان کا غم چونکہ مصنوعی نہیں بلکہ دل کی حقیقی کیفیات کا ترجمان ہے ۔ اس لیے فانی کی ہر غزل اپنے اندر ایک خاص تاثیر رکھتی ہے ۔ احتشام حسین فانی کی غزل کے بارے میں رقم طراز ہیں:

" خلوص اور ذاتی اثر پذیری نے ان کے طرزِ اظہار میں واقعیت
پیدا کر دی ہے اور لب و لہجہ میں ایک نئی کھنک سنائی دیتی ہے جو
خلوص کے بغیر ممکن نہیں ۔ جبر اور اختیار کے رسمی عقیدے میں
ذاتی اعتقاد کی وجہ سے اور قنوطیت میں نجی زندگی کی الم انگیزی کے سبب
نیا پن ہے جو طرز اظہار میں نمایاں ہوتا ہے اور فانی کو دوسرے
غزل گویوں سے الگ کر دیتا ہے "۔ (۳۷)

یاس یگانہ چنگیزی کی غزلیں رفعتِ تخیل ' حقیقت نگاری' ندرتِ فکر ' جدّتِ تشبیہات ' عمدہ بندشِ الفاظ ' طنز اور بے باکی کے لحاظ سے اردو شاعری کا بیش بہا سرمایہ ہیں ۔ " اگر یگانہ کو عشق کا ذاتی تجربہ ہوتا تو شاید ان کے لہجے میں مٹھاس اور گھلاوٹ ملتی ۔ ان کے کلام میں بیان کی شدّت ہے ' لہجے کی صفائی اور کاٹ ہے ۔ محاوروں کا استعمال اور زبان و بیان پر عبور۔ یہ باتیں ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہیں۔ وہ پیش پا افتادہ موضوعات میں بھی زبان و بیان کی خوبیوں سے جدّت پیدا کر لیتے ہیں "۔ (۳۸)

فیض ترقی پسند شعراء میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان کے اندازِ بیاں کا تیکھا پن دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے ۔ انسان دوستی ان کی غزل کا خاص موضوع ہے ۔ شدّتِ احساس نے ان کے کلام کو اثر انگیز کر دیا ہے ۔ ان کی غزلیں غمِ جاناں اور نظمیں غمِ دوراں کی ترجمان ہیں ۔ جذبات کا فنکارانہ اظہار ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی ہے ۔ اگرچہ فیض اشتراکی تصوّرات کے علم بردار ہیں لیکن " ان کی اہمیت اس میں ہے کہ انہوں نے جمالیاتی احساس کو انقلابی فکر پر قربان نہیں کیا ۔ فیض نے اپنے تخلیقی احساس سے ایسی شعری وحدت کی تخلیق کی جس کی حسن کاری ، لطافت اور دل آویزی تو احساسِ جمال کی دین ہے لیکن جس کی درد مندی اور دل آسائی سماجی احساس سے آئی ہے "۔ (۳۹)

فیض کا سماجی شعور چونکہ پختہ بنیادوں پر استوار تھا اس لیے انہوں نے بے مہریٔ حالات کے اپنی غزلوں میں نقشے کھینچے اور انسان کے دکھ درد کو موضوعِ سخن بنایا ۔ یہ کام صرف وہی دلِ درد مند کر سکتا ہے جو دولتِ احساس سے مالا مال ہو ۔ بقول ڈاکٹر حامدی کاشمیری :

" فیض کی درد مندی بلاشبہ ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے جو بعض اشعار میں ایک موجِ زیریں کی طرح اور بعض تخلیقات میں فعّال روح کی طرح موجود ہے ... فیض نے خارجیت پسندی کے باوجود گاہے گاہے دروں بینی سے کام لیا ہے اور اپنے اندرونی وجود سے رابطہ قائم کیا ہے "۔ (۴۰)

غم پسندی کی وجہ سے ناصر کاظمی کو میر ثانی کہا جاتا ہے ۔ انہوں نے ترقی پسندوں کے انداز سے ہٹ کر اظہار کے نئے اسالیب تلاش کیے ہیں ۔ ناصر نے جذبات الم کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے ۔ میر کی طرح انہوں نے چھوٹی بحروں میں دلی جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے ۔ سادہ الفاظ میں حزنیہ

کیفیات کی عکّاسی ناصر کاظمی کے فن کا ایک اہم وصف ہے ۔

ڈاکٹر وزیر آغا ناصر کاظمی کے فکر و فن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

" ناصر کاظمی کی شاعری کے مطالعے سے اس بات کا وافر ثبوت ملتا ہے کہ اس نے تخلیقی کرب میں مبتلا ہو کر ذات کے معنی آفریں اور تہہ در تہہ جہان کا رخ کیا اور پھر اپنی سیّاحت کے اثمار کو ہمارے سامنے چنتا چلا گیا ۔ اس کے کلام کی تاثیر کا اصل سبب بھی یہی ہے کہ یہ کلام ذات کی تہوں سے ابھرا ہے ، ذہن کے بالا خانے سے نازل نہیں ہوا "۔ (۴۱)

احمد ندیم قاسمی کی غزل میں نئے عہد کے رجحانات کی آب و تاب نظر آتی ہے ۔ انہوں نے اصناف و بحور کا انتخاب بھی بڑے سلیقے سے کیا ہے ۔ انہوں نے بے جا تقلید سے اپنا دامن بچایا ہے ۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کی انفرادیت کو کلام میں نمایاں ہونے کا موقع ملا ہے ۔ ندرت ، تازگی ، تیکھا پن اور برجستگی ان کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔ "احمد ندیم قاسمی نے اپنے دور کے نشیب و فراز کا جائزہ لیا ہے۔ اس لیے ان کے یہاں یاس اور امید کی دھوپ چھاؤں ملتی ہے ۔ یہ دھوپ چھاؤں عہد حاضر کی نمایاں خصوصیت ہے ... قاسمی کی غزلوں میں داخلیت کی بجائے خارجیت زیادہ پائی جاتی ہے ۔ ان کا مشاہدۂ فطرت زیادہ تیز ہے اس لیے وہ خارجی مناظر کی صحیح عکّاسی کر سکتے ہیں "۔ (۴۲)

ان شعراء کے علاوہ اور بہت سے غزل گوؤں نے اردو غزل کے ارتقامیں قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان میں جوہر،صفی،عزیز،ماہر القادری،احسان دانش اور فراق گورکھپوری خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ آرزو چوہدری، "ادب کی چھاؤں میں" لاہور: ادارہ و سن ندارد، ص ۷

۲۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر "تنقیدی زاویے" کراچی: اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۵۱ء ص ۱۰۳

۳۔ "اردو انسائیکلوپیڈیا" لاہور: فیروز سنز ۱۹۶۲ء ص ۱۰۲۰

۴۔ ظ، انصاری "زبان و بیان" دہلی: ۱۹۵۹ء ص ۱۲۷

۵۔ حمید احمد خاں، پروفیسر "تنقیدی مقالات" (میرزا ادیب، مرتّب) لاہور: لاہور اکیڈمی ۱۹۶۳ء ص ۱۰۵

۶۔ ایضاً، ص ۱۰۵، ۱۰۶

۷۔ حقی، شان الحق "نکتۂ راز" کراچی: عصری کتب ۱۹۷۲ء ص ۳۱۹

۸۔ عبداللہ، ڈاکٹر سیّد "اشاراتِ تنقید" لاہور: مکتبۂ خیابانِ ادب ۱۹۶۲ء ص ۱۳۶

۹۔ فراق گورکھپوری "اردو غزل گوئی" لاہور: ادارہ فروغِ اردو ۱۹۵۵ء ص ۵۰

۱۰۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر "ادب کا تنقیدی مطالعہ" لاہور: میری لائبریری ۱۹۶۳ء ص ۵۷

۱۱۔ وزیر آغا "تنقید اور احتساب" لاہور: جدید ناشرین ۱۹۶۸ء ص ۳۶

۱۲۔ آزاد، محمد حسین "آبِ حیات" لاہور: مکتبۂ ادبِ اردو، اردو بازار ۱۹۶۷ء ص ۸۸

۱۳۔ ممتاز حسین "تنقید کا مارکسی نظریہ" مشمولہ "اردو تنقید نگاری" (سردار مسیح گل، مرتب) لاہور:
ماڈرن پبلی کیشنز۔ عقب اردو بازار ۱۹۶۳ء ص ۱۵۰

۱۴۔ شیفتہ، نواب مصطفےٰ خاں "گلشنِ بے خار" لکھنؤ: مطبع نول کشور ۱۹۷۳ء ص ۲۱۰

۱۵۔ عبداللہ، ڈاکٹر سیّد "نقدِ میر" لاہور: مکتبۂ خیابانِ ادب ۱۹۶۸ء ص ۲۴

۱۶۔ چاند، شیخ "سودا" کراچی: انجمن ترقّیٔ اردو ۱۹۶۳ء ص ۱۲۷

۱۷۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر "مختصر تاریخِ ادبِ اردو" کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، مشن روڈ ۱۹۵۶ء ص ۸۱

۱۸۔ صفی مرتضیٰ، سیّد "چند ممتاز شعراء" لکھنؤ: نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ، سن ندارد، ص ۱۰

۱۹۔ ثاقب صدیقی، انیس احمد "خواجہ میردرد (تنقیدی و تحقیقی مطالعہ)" دہلی: انجمن ترقّیٔ اردو ہند ۱۹۸۹ء ص ۱۹، ۲۰

۲۰۔ اعجاز حسین، سیّد "نئے ادبی رجحانات" حیدر آباد دکن بھارت: نفیس اکیڈمی ۱۹۳۶ء بارِ سوم ص ۳۲

۲۱۔ احتشام حسین "انتخابِ احتشام حسین" (فقیر احمد فیصل، مرتب) لاہور: لاہور اکیڈمی، سن ندارد، ص ۴۳

۲۲۔ ن، بخاری "اشارات" کراچی: پاک یونین سٹور ۱۹۶۷ء ص ۷۹

۲۳۔ شبیہہ الحسن نونہروی "تنقید و تحلیل" لکھنؤ: ادارہ فروغِ اردو ۱۹۵۸ء ص ۵۵

۲۴۔ رشید احمد صدیقی، پروفیسر "نقش ہائے رنگ رنگ" ملتان: کاروانِ ادب ۱۹۷۵ء ص ۱۰۳

۲۵۔ پیام شاہجہاں پوری "روحِ نگارش" لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس ۱۹۵۵ء ص ۱۳۵

۲۶۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر "غزل اور مطالعہ غزل" کراچی: انجمن ترقّیٔ اردو ۱۹۵۵ء ص ۳۴۰

۲۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر "تنقید اور تجربہ" لاہور: یونیورسل بکس اردو بازار ۱۹۸۸ء ص ۱۷۶

۲۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز اردو بازار ۱۹۸۷ء ص ۱۸۸

۲۹۔ اختر اورینوی "قدر و نظر" لکھنؤ: ادارہ فروغِ اردو ۱۹۵۵ء ص ۹۳

۳۰۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر "اردو تنقید کا ارتقاء" کراچی: انجمن ترقّیٔ اردو ۱۹۵۱ء ص ۱۷۱

۳۱۔ آسی ضیائی "تاریخِ زبان و ادبِ اردو" لاہور: ڈوگر سنز اردو بازار ۱۹۹۲ء ص ۶۸

۳۲۔ عبدالقادر سروری "جدید اردو شاعری" لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۶۷ء ص ۲۹۸، ۲۹۹

۳۳۔ معراج نیرؔ، سید ‘‘ حسرت موہانی ۔ تنقیدی مطالعہ ’’ لاہور: مکتبۂ میری لائبریری ۱۹۷۳ء ص ۹۹

۳۴۔ صادق حسین، آغا ‘‘ برووشِ ہوا ’’ لاہور: اشاعتِ ادب ۱۹۶۱ء ص ۱۱

۳۵۔ صدیق جاوید ‘‘ بالِ جبریل کا تنقیدی مطالعہ ’’ لاہور: یونیورسل بکس ۔ ۴۰ ۔ اے اردو بازار ۱۹۸۷ء

۳۶۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر ‘‘ آج کا اردو ادب ’’ لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ ۱۹۷۰ء ۱۵۷، ۱۵۸

۳۷۔ احتشام حسین ‘‘ تنقیدی جائزے ’’ لکھنؤ: احباب پبلشرز ۱۹۵۶ء ص ۲۲۸

۳۸۔ سجاد باقر رضوی ‘‘ تہذیب و تخلیق ’’ لاہور: مکتبۂ ادبِ جدید ۱۹۶۶ء ص ۱۸۹

۳۹۔ گوپی چند نارنگ ‘‘ ادبی تنقید اور اسلوبیات ’’ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۹ء ص ۲۱۵

۴۰۔ حامدی کاشمیری، ڈاکٹر ‘‘ تفہیم و تنقید ’’ نئی دہلی: نئی آواز جامعہ نگر ۱۹۸۸ء ص ۳۰

۴۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر ‘‘ تنقید اور مجلسی تنقید ’’ سرگودھا: مکتبہ اردو زبان ۱۹۷۶ء ص ۱۸۰

۴۲۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر ‘‘ ادبی اشارے ’’ لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس ۱۹۶۵ء ص ۳۳۰، ۳۳۱

اردو نظم کا تاریخی و فنی پس منظر

نظم کا لفظ مختلف حوالوں سے مختلف مفاہیم واضح کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ’’لفظ نظم کا عام مفہوم نثر کے برعکس وہ کلام ہے جو اوزان شعری کا تابع ہو‘‘ (۱)۔ عام طور پر نظم کے لفظ کو نثر سے ممیز کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی نظم کہہ کر اس سے شاعری مراد لی جاتی ہے اور اس شاعری میں تمام اصنافِ شعر (مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، رباعی وغیرہ) موجود ہوتی ہیں۔ ’’شاعری خواہ مخصوص قسم کا تعمیری حسن رکھتی ہو یا تنظیم سے معرّیٰ ہو، نظم ہی کہلائے گی‘‘۔ (۲)

شمیم احمد لکھتے ہیں:

’’نظم کی صنفی شناخت یا مُکلّیہ نہ تو موضوع پر منحصر ہے اور نہ ہیئت پر۔ اردو شاعری کی مختلف اصناف دراصل نظم ہی کی مختلف قسمیں ہیں۔ اسی طرح اردو شاعری میں مروّج تمام ہیئتیں بشمول غزل اور مثنوی کی ہیئتوں کے، نظم کے لیے استعمال کی گئی ہیں‘‘۔ (۳)

نظم میں کسی ایک خیال یا کیفیت کو پیش کیا جاتا ہے اور تسلسلِ خیال کو بہر صورت قائم رکھا جاتا ہے۔ اردو نظم کا عہد بہ عہد ارتقاء اور اس کا تاریخی و فنی پس منظر ایک لمبی داستان ہے۔ جس کا یہاں

مجمل انداز میں ذکر کیا جاتا ہے ۔ اردو کا پہلا نظم گو شاعر محمد قلی قطب شاہ ہے ۔ اس نے سادہ اسلوب میں ہندوستانی رسم و رواج اور تہواروں پر نظمیں لکھ کر شہرت پائی ۔

اردو شاعری کی تاریخ میں اگرچہ میر تقی میر اور سودا کو نظم گو شعراء کی حیثیت نہیں دی گئی لیکن ان شعراء نے مخمّس ، ہجوں ، شہر آشوبوں اور مثنویوں کے ذریعے مسائلِ حیات کو دلچسپ اسلوب میں پیش کیا اور اپنے عہد کے سیاسی ، اخلاقی اور سماجی انحطاط کی کامیاب عکّاسی کی ۔ ان کے موضوعات کے تنوّع نے نظم کے نئے امکانات کی نشان دہی کی اور آگے چل کر شعراء نے اپنے انفرادی و اجتماعی ، داخلی و خارجی اور نظریاتی و فلسفیانہ افکار کو نظم کے سانچے میں ڈھالا۔

نظیر اکبر آبادی نے اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے نظموں کے ذریعے اپنی ذات اور اپنے عہد کے رجحانات کی تصویر کشی کی ۔ انہوں نے بچپن ، جوانی ، بڑھاپا ، تغیراتِ جہاں ، امارت ، غربت ، موت و حیات ، مذہب، اور عشق وغیرہ ہر موضوع پر خامہ فرسائی کی ۔ ان کی قوت متخیلہ کی بلند پروازی اور قادرالکلامی نے مظاہرِ حیات کی ترجمانی کر کے نظم نگاری کو نئی روایات سے شناسا کیا ۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا

> " اردو نظم میں نظیر کی سب سے بڑی عطا یہ ہے کہ اس نے شعر کو آسمان سے اترنے اور زمین کی بو باس سونگھنے کی طرف متوجہ کیا اور یوں اپنے وطن کی دھرتی اور اس کی اشیاء ہی کو نہیں بلکہ اس کی روایات ، تلمیحات اور ثقافتی مظاہر سے بھی گہری وابستگی کا ثبوت بہم پہنچایا " ۔ (۴)

نظیر نے عوامی زندگی کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا اور وہ زبان استعمال کی جسے عوام سمجھ سکیں ۔ " ان کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ عوام النّاس کے خیالات جذبات اور ان کی بول چال کو خود انہیں کی زبان سے ظاہر کرتے ہیں " ۔ (۵)

عام خیال یہ ہے کہ نظم گوئی کا باقاعدہ آغاز دورِ جدید میں ہوا ہے ۔ ۱۸۶۷ء میں مولانا محمد حسین آزاد نے لاہور میں انجمنِ پنجاب کی بنیاد ڈال کر نظم نگاری کی تحریک کا آغاز کیا ۔

مئی ۱۸۷۴ء میں انجمنِ پنجاب کی طرف سے ایسے مشاعروں کا اہتمام کیا گیا جہاں طرحی مصرعوں کی بجائے نظموں کے موضوعات دیے گئے ۔ ایسے مشاعروں کو مناظموں کا نام دیا گیا ۔ ان مناظموں میں بہت سی ادبی و علمی شخصیات شریک ہوا کرتی تھیں ۔ ان شخصیات میں آزاد اور حالی کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا ذکاء اللہ خصوصاً قابل ذکر ہیں ۔ حالی نے اپنی مشہور مثنویاں برکھا رت ، نشاطِ امید ، حبِّ وطن اور مناظرۂ رحم و انصاف انہی مناظموں میں پیش کیں ۔ اسی دور میں اسماعیل میرٹھی ، اکبر الٰہ آبادی ، مولانا شبلی ، سرور جہاں آبادی ، نادر کاکوروی ، اقبال ، چکبست ، صفی لکھنوی ، شوق قدوائی اور ظفر علی خاں وغیرہ نے اپنی مساعی کے ذریعے اس صنفِ شعر میں ایک نئی روح پھونک دی ۔

اگرچہ محمد حسین آزاد نے جدید انداز کے مناظمے منعقد کر کے نظم گوئی کی بنیاد ڈالی لیکن الطاف حسین حالی نے ذوق و شوق سے نظمیں لکھ کر شاعری میں نئے رجحانات داخل کیے ۔

حالی کی نظمیں منظر نگاری ، سیرت نگاری ، فلسفۂ اخلاق ، واقعہ نگاری ، فلسفۂ قومیت ، صداقت شعاری ، انسان دوستی ، سادگی اور بے ساختگی کے لحاظ سے اچھی شاعری کا ایک نادر نمونہ ہیں ۔ جیلانی کامران ان کی مسدّس " مدوجزرِ اسلام " کے بارے میں لکھتے ہیں :

> " حالی کی مسدّس جس تہذیبی دورِ آزمائش کا اعلان کرتی ہے ، مسلمانوں کی تہذیب ابھی تک اسی دورِ آزمائش سے گزر رہی ہے ۔ مسدّسِ حالی اس لحاظ سے مسلمانوں کے دورِ جدید کی سب سے بڑی نظم ہے ۔ کیونکہ یہ نظم ایک طرف اسلام کو تہذیبی تصوّر کے طور پر پیش کرتی ہے اور دوسری طرف اسلام کو ایک تہذیب کے نام سے موسوم بھی کرتی ہے " ۔ (۶)

حالی کی طرح شبلی نعمانی بھی اگرچہ دل میں قومی درد رکھتے ہیں لیکن انکی منظومات کا ایک خاص انداز ہے ۔ وہ بصیرت یافتہ تاریخ داں بھی ہیں اور سیاسی حالات کے جائزہ نگار بھی ۔ انہوں نے تاریخ و سیاست

کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور وہ مصلحت پسندی کی بجائے جوش و خروش اور جرأت اور بے باکی سے تلخ حقائق کو نظموں کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ "شبلی نے اسلامی تاریخ کے بہت سے اہم واقعات کو نظم میں بیان کیا ہے اور ان نظموں کے ذریعے اسلامی احکام و تعلیمات کو دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے"۔ (۷)

شبلی کی تاریخی و اخلاقی نظمیں ان کے اسلامی مزاج اور گہرے سماجی شعور کی پیداوار ہیں ۔ " ان کے اسلوب میں ایک شگفتگی ' بانکپن اور چستی ملتی ہے ۔ شبلی کے یہاں عالمانہ شان ہے مگر خشکی نہیں ۔ شبلی زاہدِ خشک نہیں تھے ' وہ شاعر تھے "۔ (۸)

چکبست کی نظموں کے مخصوص موضوعات نے انہیں نظم نگاری کے میدان میں انفرادی خصوصیت عطا کر دی ہے ۔ ان کے یہاں معاملاتِ حسن و عشق برائے نام نظر آتے ہیں ۔ وہ مشرقی تہذیب و تمدن کے دلدادہ ہیں ۔ ان کی نظموں میں اہلِ وطن کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کا پیغام ملتا ہے ۔ سیاسی حالات کو منظوم پیرائیہ اظہار عطا کرنا ان کا امتیازی جوہر ہے ۔ ان کا ناصحانہ کلام بھی تاثیر سے خالی نہیں ۔ ان کی ذاتی زندگی بھی شرافت ' وضعداری اور سادگی کا عمدہ نمونہ ہے ۔ اثر لکھنوی ان کے فکر و فن کے بارے میں لکھتے ہیں :

> " چکبست کا کلام ان کے کردار کا آئینہ ہے ۔ انتہائی غیرت اور خودداری کے باوجود کبر و نخوت کا شائبہ نہیں ۔ سوز و گداز و خستگی کے باوصف یاس و حرماں کی افسردگی ہے نہ محرومی کی فریاد و زاری ۔ جوش و خروش کی فراوانی ہے مگر کلام مبالغے سے پاک اور حقیقت سے ہمکنار ہے "۔ (۹)

نظم گو شعراء میں اقبال کا مقام بہت بلند ہے ۔ وہ زبان و بیاں کی نزاکتوں سے بھی واقف تھے اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے رازداں بھی تھے ۔ " اقبال نے اردو شاعری کو خودی کے تصوّر سے آشنا کیا۔ انقلاب کے خیال کو عام کیا اور غور و فکر کی گہرائیاں عطا کیں "۔ (۱۰)

ان کے ابتدائی دور کی نظموں میں قومیت و وطنیت کے نظریے کی حمایت موجود ہے ۔ لیکن جب وہ انگلستان سے تعلیم حاصل کر کے واپس آئے تو ان کے ذہن سے جغرافیائی اور سیاسی نظریے کا غبار چھٹ چکا تھا ۔ چنانچہ وہ اتحاد بین المسلمین کے داعی بن گئے ۔ انہوں نے اپنی نظموں میں مسلمانوں کو اتحاد ' اتفاق اور یکجہتی کا پیغام دیا اور مغربی تہذیب کے زہریلے اثرات سے آگاہ کیا ۔ انہوں نے اپنے کلام کے ذریعے مسلمانوں کو اسلامی فلسفۂ حیات سے روشناس کرنے کی کوشش کی اور مادّیت پرستی سے روحانیت کی طرف متوجہ کیا ۔ ڈاکٹر ابواللّیث صدیقی ' کلامِ اقبال کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> " اقبال نے اردو شاعری کے رخ کو موڑ دیا اور زندگی کے حقائق کا ایک وسیلہ بنایا۔ ان کی شاعری نے اردو شاعری کا مزاج بدل دیا ۔ اس میں درماندگی ' بے چارگی اور محرومی کا جو یاس انگیز اور حسرت خیز انداز تھا اس کی جگہ ایک توانائی ' امنگ اور ولولہ پیدا کیا ۔ قنوطیت کی جگہ رجائیت ' مایوسی کی جگہ امید ' خوف کی جگہ جرأت کا مسلک عام کیا "۔ (۱۱)

اقبال کے بعد جوش نے خاصی شہرت پائی ۔ ان کی ابتدائی نظموں میں زیادہ تر مناظرِ فطرت کی تصویر کشی پائی جاتی ہے ۔ ان کی سیاسی و رومانی نظموں میں لہجے کی گھن گرج اور ہیجانی کیفیات کا اظہار ملتا ہے ۔ پر شکوہ الفاظ اور نادر تشبیہات و استعارات ان کے کلام کی پہچان ہیں ۔

پاکستان کے قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری کے گیت ' مترنم بحروں ' رواں دواں الفاظ اور موسیقیت کی وجہ سے اردو کی غنائی شاعری میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں ۔ لیکن ان کا اصل اور یادگار کارنامہ " شاہنامۂ اسلام " ہے جس میں انہوں نے اسلامی تاریخ کو نظم کیا ہے ۔

اختر شیرانی کا رومانی شعراء میں شمار کیا جاتا ہے ۔ ان کی رومانی شاعری میں غم کی شدّت نہیں بلکہ رنگینی ' ملائمت اور رجائیت پائی جاتی ہے ۔ وہ حسن پرستی اور ہوس پرستی میں فرق ملحوظ رکھتے ہیں ۔ ان کی

نظموں میں حسن کاری جمال آفرینی اور ماورائی بے خودی پائی جاتی ہے ۔ اختر نے عریانی و ابتذال سے دامن بچانے کی کوشش کی ہے ۔ حسن و عشق اختر شیرانی کے کلام کے بنیادی اجزاء ہیں ۔ وہ عورت کو قدرت کا انمول تحفہ اور حسین ترین تخلیق سمجھتے ہیں ۔ اسی لیے ان کی نظموں کا محور و مرکز عورت ہے ۔

بقول ڈاکٹر محمد حسن:

" عورت' اس کا حسن ' اس کی محبت اختر کے نزدیک خلاصۂ کائنات ہے۔ اختر نے روز مرہ کی زندگی اور اس کی یکسانیت کو ٹھکرا دیا ہے اور اپنے لیے زمین و آسماں سے الگ ایک نئی دنیا کی تعمیر کی ہے ۔ بہاروں اور فطرت کے نظاروں کی دنیا ' پاکیزگی خلوص اور جذباتی وفور کی دنیا ' ہر رومانوی کی طرح اختر کے کلام کی بھی بنیادی قدر یہی ہے "۔ (۱۲)

اختر شیرانی نے تصوّرِ عشق کو بدلا ۔ انہوں نے عذرا و سلمیٰ کے روپ میں ایسی محبوباؤں کا تصور پیش کیا ہے جو اسی دنیا اور اسی ماحول کی رہنے والی ہیں ۔ بقولِ آل احمد سرور:

" ان کا عشق قدیم شعراء کی طرح نہ کسی تجلّیٔ موہوم کا عشق ہے نہ متوسّطین کی شاہدِ بازاری کا نہ ایک سرد و بے رنگ عورت کا ۔ بلکہ ایک ایسی عورت کا عشق ہے جو اس دنیا کی ہے ' پہلو میں دل رکھتی ہے اور دل میں لطیف جذبات ۔ جو شاعر کے عشق سے متاثر بھی ہوتی ہے اور کبھی کبھی اپنے جذبات کا اظہار بھی کرتی ہے لیکن بعض اوقات سماجی بندشیں اسے اجازت نہیں دیتیں کہ محبت کا جواب محبت سے دے "۔ (۱۳)

احسان دانش کو شاعرِ مزدور کہا جاتا ہے ۔ انہوں نے چونکہ خود ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی اس لیے انہوں نے اپنی نظموں میں غریب اور مزدور طبقے کے مسائل اور تلخیوں کو نہایت مؤثر

دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے ۔ ان کی رومانی نظمیں بھی بڑے والہانہ و پُر تاثیر اسلوب میں لکھی گئی ہیں ۔ فرزانہ سیّد لکھتی ہیں:

" احسان دانش کے یہاں شیریں الفاظ بھی موجود ہیں اور دلکش و پُرکشش تراکیب بھی ۔ دیہات کا رنگ بھی ہے اور مانوس ماحول بھی ۔ وہ ٹھہراؤ سے بھی متصّف ہیں اور علمی وقار کو بھی برقرار رکھتے ہیں ۔ وہ فنی لطافتوں کے ساتھ ساتھ روایت کے بھی علم بردار ہیں ۔ ان کے یہاں موضوعات میں تنّوع اور خیالات میں گہرائی بھی ہے ۔ وہ شگفتہ ' پاکیزہ اور متین زبان و بیان کے دھنی ہیں "۔ (۱۴)

احسان دانش نے تخیّل سے زیادہ سماجی حقائق اور تجرباتی شواہد کو موضوعِ سخن بنایا ہے ۔ وہ تیز مشاہدے کی بدولت مظاہرِ حیات کے باریک سے باریک پہلو کو بھی احاطۂ گرفت میں لے آتے ہیں ۔ بقول عبدالقادر سروری:

" عام طور پر احسان کا اندازِ بیاں ' ان کی تشبیہیں اور استعارے عام فہم ہوتے ہیں ۔ بیانیہ شاعری اور مرقع نگاری کرتے ہوئے وہ ایسی جزئیات کو بھی نظرانداز نہیں کرتے ' جن پر دوسروں کی نظر نہیں پڑتی "۔ (۱۵)

اسرار الحق مجاز اپنی نظموں میں فرسودہ روایتی نظام کے خلاف احتجاج کرتے ہیں ۔ ان کے کلام میں سماجی ماحول کو بدلنے کی آرزو ملتی ہے ۔ متوسّط طبقے کے ابتر حالات ' نوجوانوں کی بے روزگاری اور مفلسی ان کی منظومات کے خاص موضوعات ہیں ۔ فکر ' اعتراف ' خوابِ سحر اور عشرتِ تنہائی ان کی مشہور نظمیں ہیں ۔ احتشام حسین ان کے فکر و فن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

" مجاز کی شاعرانہ اور فنکارانہ صلاحیت نے انہیں نغمہ اور ترنّم ' کرب اور نشاط ' خیال پرستی اور سماجی شعور کا ایک حسین مرکّب بنا

دیا ہے ... حقیقی سیاسی شعور کی ابتدا مجاز سے ہوتی ہے ۔ مجاز کے
کلام میں رومانیت کے باعث فن کارانہ وابستگی ، گرم جوشی ، تفکّر اور
شعریت کا اضافہ ہو جاتا ہے "۔ (۱۶)

ساحر لدھیانوی کی نظموں میں معاشی ناہمواریوں کے خلاف احتجاج ملتا ہے لیکن یہ احتجاج دیگر ترقّی پسندوں کی تحریروں کی طرح سیاسی پروپیگنڈے کا روپ اختیار کر لیتا ہے ۔

شورش کاشمیری اور نعیم صدیقی نے زیادہ تر سیاسی ، سماجی اور اسلامی موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔

شکیل بدایونی نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں ۔ رومانی نظموں کے علاوہ ان کی نعتیں بھی عقیدت و محبت کا مظہر اور قدرتِ کلام کی ترجمان ہیں ۔

حمدیہ و نعتیہ منظومات بھی ہر دور میں لکھی جاتی رہی ہیں ۔ حالی ، محسن کاکوروی ، اقبال ، بیدم وارثی ، بہزاد لکھنوی ، ظفر علی خاں ، حفیظ جالندھری ، ماہر القادری ، نعیم صدیقی ، حفیظ تائب ، مظفر وارثی ، عبدالعزیز خالد ، راغب مراد آبادی ، جعفر بلوچ ، آثم فردوسی ، ایاز صدیقی ، ہلال جعفری اور احسان دانش کا شمار نمایاں نعت نگاروں میں ہوتا ہے ۔

اردو نظم نگاری کو صالح روایات سے ہم آہنگ کرنے والے شعراء میں اسد ملتانی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں ۔ ان کے بارے میں اگرچہ کچھ زیادہ نہیں لکھا گیا ۔ تاہم وہ ایسے قومی شعراء میں شامل ہیں جنہیں کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ "ان کی نظموں میں اکبر کا طنز ، حالی کے پند و نصائح ، قومی درد ، اقبال کا تفکّر اور حب الوطنی کا ایک نہایت عمدہ امتزاج ملتا ہے ۔ موجودہ دور میں وہ واحد شاعر تھے جس نے حالی اور اقبال کی روشِ شاعری کو نہ صرف کامیابی کے ساتھ برتا بلکہ اس لے کو آگے بڑھایا اور اس کی مصلحانہ شان برقرار رکھی "۔ (۱۷)

۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک غیر ملکی نظریات اور ایک مخصوص سیاسی فلسفے کو لے کر اٹھی تھی لیکن چونکہ اس کا دائرہ کار محدود اور خیالات مستعار تھے اس لیے جلد ہی ناکام ہو گئی ۔ اس کی ناکامی کی وجہ کچھ

"ایمان و ایقان کی کمی اور کچھ مخصوص حالات کی عدم موجودگی تھی جس میں اشتراکیت کو پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے ۔ یہ تحریک اعتماد کی بجائے ذہنی خلفشار اور سماجی انتشار ہی تک محدود رہ گئی "۔ (۱۸)

ترقّی پسند تحریک کے زیرِ اثر آزاد نظم کو عروج حاصل ہوا ۔ آزاد نظم قافیہ و ردیف کی پابندی سے آزاد ہے ۔ اس میں اگرچہ اوّل تا آخر ایک ہی بحر کا التزام کیا جاتا ہے لیکن بحر کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے کہیں چھوٹا اور کہیں بڑا کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اوزان میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے ۔

آزاد نظم کی ابتدا کرنے والے اگرچہ عبدالحلیم شرر تھے لیکن ان کے دور میں وہ ماحول نہ تھا جس میں یہ صنفِ سخن نشوونما پا سکتی ۔ جب حالات سازگار ہوئے تو ڈاکٹر تصدق حسین خالد اور ن ۔ م ۔ راشد نے اسے رواج دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے ساتھ ساتھ میراجی ، جواد زیدی ، ضیاء جالندھری ، سردار جعفری ، ساحر لدھیانوی ، مختار صدیقی اور احمد ندیم قاسمی نے اس صنف کو خاصی ترقی دی ۔ آزاد ، نثری اور معریٰ نظم نے جدید دور میں اگرچہ خاصا رواج پایا ہے لیکن پابند نظم کی قدر و منزلت اور مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

موجودہ دور کے ایک بڑے شاعر رئیس امروہوی نے کئی شعری اصناف میں طبع آزمائی کر کے مشّاق اور قادر الکلام شاعر ہونے کا ثبوت دیا ہے ۔ انہوں نے نظم گوئی کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے ۔ ان کی حمدیں ، نعتیں ، منقبتیں اور ملّی و رومانی نظمیں ان کی قادر الکلامی کا بیّن ثبوت ہیں ۔

حوالہ جات

۱۔ خاطر غزنوی ' " جدید اردو ادب " لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز اردو بازار ' ۱۹۸۵ء ' ص ۱۳۱

۲۔ احتشام حسین ' " اردو نظم کا تاریخی اور فنی ارتقاء " مشمولہ " روحِ تنقیدی ادب " (محمد یعقوب خاں ' مرتب) عشرت پبلشنگ ہاؤس ' ۱۹۶۴ء ' ص ۹۹

۳۔ شمیم احمد ' " اصنافِ سخن اور شعری ہیئتیں " لاہور: مکتبۂ عالیہ اردو بازار ' ۱۹۸۳ء ' ص ۱۱ ' ۱۲

۴۔ وزیر آغا' ڈاکٹر ' " اردو شاعری کا مزاج " لاہور: مکتبۂ عالیہ ' ۱۹۸۴ء ' ص ۳۴۰

۵۔ رام بابو سکسینہ ' " تاریخِ ادب اردو " لاہور: گلوب پبلشرز چوک مینار انار کلی ' سن ندارد ' ص ۳۸۷

۶۔ جیلانی کامران ' " تنقید کا نیا پس منظر " لاہور: مکتبۂ ادبِ جدید ' ۱۹۶۳ء ' ص ۹۵

۷۔ ہارون الرشید' پروفیسر ' " اردو ادب اور اسلام " (جلد اول حصۂ نظم) لاہور: اسلامک پبلی کیشنز ' ۱۹۶۸ء ' ص

۸۔ آل احمد سرور ' " تنقید کیا ہے " کراچی: اردو اکیڈمی سندھ ' ۱۹۵۲ء ص ۴۷

۹۔ اثر لکھنوی " چھان بین " لکھنؤ: سرفراز قومی پریس ' ۱۹۵۰ء ص ۷

۱۰۔ عبادت بریلوی' ڈاکٹر ' " تنقیدی زاویے " کراچی: اردو اکیڈمی سندھ ' ۱۹۵۱ء ' ص ۲۶۱

۱۱۔ ابواللیث صدیقی ' " آج کا اردو ادب " لاہور: فیروز سنز ' ۱۹۷۰ء ص ۱۰۶

۱۲۔ محمد حسن' ڈاکٹر ' " اردو ادب میں رومانوی تحریک " لاہور: شیخ محمد بشیر اینڈ سنز اردو بازار ' ۱۹۵۵ء ' ص ۶۵

۱۳۔ آل احمد سرور ' " ادب اور نظریہ " لکھنؤ: ادارہ فروغِ اردو ' ۱۹۵۴ء ' ص ۸۰ ' ۸۱

۱۴۔ فرزانہ سید ' " نقوش ادب " لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز اردو بازار ' ۱۹۸۶ء ص ۲۲۱

۱۵۔ عبدالقادر سروری ' " جدید اردو شاعری " لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ' ۱۹۶۷ء ' ص ۲۸۸

۱۶۔ احتشام حسین ' " تنقید اور عملی تنقید " لکھنؤ: ادارہ فروغِ اردو ' ۱۹۶۱ء ' ص ۲۷۱ ' ۲۷۲

۱۷۔ جمیل نقوی ' " تنقید و تفہیم " کراچی: ادب نما اے ۱۱۹ ۔ بلاک جے شمالی ناظم آباد ' ۱۹۸۴ء ' ص ۱۳۷

۱۸۔ ریاض احمد ' " تنقیدی مسائل " لاہور: اردو بک سٹال بیرون لوہاری گیٹ ' ۱۹۶۱ء ' ص ۱۳۲

اردو مرثیہ ۔ ماضی و حال کے آئینے میں

مرثیہ عربی لفظ "رثا" سے بنا ہے ۔ اس سے مراد ایسی نظم ہے جس میں کسی مرنے والے کی مدح و توصیف اور اظہار رنج و غم کیا جائے ۔ ظاہر ہے کہ حزنیہ کیفیات کا اظہار وہی کر سکتا ہے جس کا مرنے والے کے ساتھ خصوصی تعلق ہو ۔ " مرثیے کا ضروری عنصر خلوص اور وفاداری ہے ۔ کیونکہ بغیر اس کے مرثیے میں تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی ۔ چنانچہ مرزا غالب کا مرثیہ عارف پر ' حالی کا مرثیہ غالب پر اور اقبال کا مرثیہ داغ پر --- اردو میں مرثیہ گوئی کی بہترین مثالیں ہیں جن میں خلوص اور صداقت بدرجۂ اتم موجود ہے " (۱)۔ مرثیے کی دوسری قسم میں دینی رہنماؤں بالخصوص حضرت امام حسینؓ اور ان کے اعزہ و شہدائے کربلا کا ذکر کیا جاتا ہے ۔

مرثیہ اردو شعراء کا اپنا ایجاد کردہ ہے ۔ یہ دیگر اصنافِ شعر کی طرح کسی اور زبان کی روایت کو پیشِ نظر رکھ کر نہیں لکھا گیا ۔ یہ صنفِ شعر کئی خصائص کا مجموعہ ہے ۔ اس میں غزل کی طرح جذبات و احساسات کی عکاسی کی جاتی ہے اور مثنوی و قصیدہ کی طرح خارجی مناظر و مظاہرِ فطرت کی مصوری کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں ۔

مرثیے کے اجزائے ترکیبی میں چہرہ' سراپا' رخصت ' آمد ' رجز ' جنگ ' شہادت ' بین اور ساقی نامہ شامل ہیں ۔ مرثیے کے موضوعات ایسے واقعات پر مبنی ہوتے ہیں جن میں سراپا' رزم ' بزم ' خود ستائی ' تلوار اور گھوڑے کی تعریف پائی جاتی ہے ۔

ہیئت کے اعتبار سے پہلے مرثیہ مثلّث ' مربّع اور مخمّس کی شکل میں لکھا جاتا تھا۔ انیس اور دبیر کے دور سے کچھ پہلے شعراء نے دوسری تمام ہیئتیں ترک کر دیں اور مرثیہ صرف مسدّس کی شکل میں لکھا جانے لگا۔ اور یہ صنفِ سخن واقعاتِ کربلا کے اظہار کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی ۔ مرثیے کی ہیئت کے بارے میں سید اعجاز حسین کا بیان ہے :

" یہ صرف مرثیے کا اثر تھا کہ مسدّس کی شکل اس قدر ہر دلعزیز ہو گئی ۔ انیس و دبیر نے اپنے کلام کو مسدّس میں اتنے متوثر انداز میں پیش کیا تھا کہ بیانیہ شاعری کے لیے یہی صورت آنے والی نسلوں کو بہترین معلوم ہوئی ۔ چنانچہ دورِ جدید کے اکثر سربرآوردہ شعراء آزاد ' حالی ' اقبال ' چکبست وغیرہ نے اپنے بیانات زمانے تک پہنچانے کے لیے مسدّس ہی کا انتخاب کیا"۔ (۲)

ابتداء میں دکنی شعراء نے مرثیے لکھے۔ بعد میں سودا' آبرو' میر ضاحک' میر تقی میر' مصحفی' نظیر اکبر آبادی اور قائم چاند پوری نے مرثیے کے خدوخال نکھارنے اور سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ خلیق' ضمیر' دلگیر' فصیح' انیس اور دبیر نے صوری و معنوی لحاظ سے اس صنفِ شعر کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔

میر ضمیر کے مرثیوں میں کئی ایسے خصائص ملتے ہیں جنہوں نے اس صنفِ شعر کو ان غیر موزوں الفاظ و تراکیب سے پاک کیا جو قدیم مرثیہ نگاروں کے ہاں بکثرت موجود تھے ۔ تشبیہات کی جدت اور تخیل کی ندرت کے حوالے سے انہوں نے مرثیہ نگاری کو نئی جہتوں سے متعارف کرایا ۔ جنگی مناظر کی تصویر کشی میں انہیں خصوصی مہارت حاصل تھی ۔

شبیہ الحسن ' میر ضمیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

" جس شاعر نے مرثیے کے اجزا مرتب کیے ' اخلاقی شاعری کو رواج دیا اور زبان و بیان کو معراجِ کمال تک پہنچایا وہ میر ضمیر تھے ۔ میر ضمیر نے مرثیے کا کینوس وسیع کیا اور اسے جدید تقاضوں کے مطابق بنانے کی کوشش کی ... یہی سبب ہے کہ بیشتر ناقدین نے میر ضمیر کو انیس و دبیر کا اصل پیش رو قرار دیا ہے "۔ (۳)

میر ببر علی انیس کے مرثیے فصاحت و بلاغت ' تشبیہات و استعارات ' واقعہ نگاری ' کردار نگاری ' جذبات نگاری اور منظر کشی کے حوالے سے فنِ مرثیہ نگاری کے جملہ لوازمات پورے کرتے ہیں ۔ انہوں نے اردو مرثیہ نگاری کو ایک باوقار مقام عطا کیا ہے ۔ اہل بیت کے جذبات کی مصوّری ہو یا واقعاتِ کربلا کا بیان ' انیس کے یہاں اصلیّت کا رنگ نمایاں رہتا ہے ۔ اسی اصلیّت و واقعیّت نے ان کے مرثیوں کو وقیع اور معتبر بنادیا ہے ۔ بقولِ شبلی نعمانی:

" میر انیس نے جس قدر واقعات لکھے ہیں ' باوجود رقّت انگیز اور متوثر ہونے کے واقعیّت کے قالب میں اس قدر ڈھلے ہوئے ہیں کہ کہیں سے ان پر حرف گیری نہیں ہو سکتی "۔ (۴)

انیس انسانی فطرت کے نبض شناس ہیں ۔ انسانی نفسیات کی تصویر کشی میں انہیں کمال حاصل ہے ۔ بلاغت کا یہ تقاضا ہے کہ تخلیق کار کا بیان اشخاص کی حرکات و سکنات اور سیرت سے مطابقت رکھتا ہو ۔ ڈاکٹر احرار نقوی لکھتے ہیں :

" انیس نے سینکڑوں مرثیے لکھے ہیں ۔ لاکھوں کی تعداد میں اشعار قلم بند کیے ہیں ۔ انسانی نفسیات و خصائل کے بہت ہی عجیب و غریب پہلوؤں کو واضح کیا ہے ۔ نفسیات و جذبات کو زبان اور تصویر عطا کی

ہے ۔ اظہار و ابلاغ کی خوابیدہ صلاحیتوں کو حرف و صوت لے مدارج

> دیئے اور اس طرح فکر و فن میں افق در افق پیدا کر دیئے "۔ (۵)

حالی کے قول کے مطابق:" واقعات کی نقشہ کشی اور تاثیرِ بیاں کے لحاظ سے میر انیس نے اردو شاعری کو اعلیٰ درجے پر پہنچا دیا"۔ (۶)

مرزا دبیر، میر ضمیر کے شاگرد تھے ۔ جدید تشبیہات و استعارات، شوکتِ الفاظ اور زورِ کلام کی وجہ سے وہ اردو مرثیہ نگاری کی آبرو ہیں ۔ مضمون آفرینی اور صنائع و بدائع کے استعمال کی وجہ سے ان کا اساتذۂ سخن میں شمار ہوتا ہے ۔ ان کا کلام ان کی جدّتِ فکر کا آئینہ دار ہے ۔ " چہرہ اور سراپا میں مضمون آفرینی دبیر کی امتیازی خصوصیت ہے ۔ انہوں نے اپنی قوتِ تخیّل اور بلندئ افکار کی مدد سے نئے نئے پہلو نکالے ہیں"۔ (۷)

میر انیس اور مرزا دبیر کی فصاحت و بلاغت نے فنِ مرثیہ نگاری کو بامِ عروج پر پہنچا دیا ہے ۔ زبان و بیاں پر قدرت، مشاہدات و تجربات کی بوقلمونی اور دلکش اسلوبِ سخن نے ان مرثیہ نگاروں کے کارناموں کو وہ شہرت بخشی ہے جو بہت کم شعراء کے حصے میں آئی ہے ۔ " شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر میں انیس و دبیر کے مرثیوں کی قدر و قیمت کے تعیّن کے لیے جس پیمانے کو تمام تنقیدی پیمانوں پر اہمیت دی ہے وہ فصاحت و بلاغت کا ہی پیمانہ ہے"۔ (۸)

اگرچہ بیسویں صدی کے آغاز تک اردو شعراء کا رجحان طبع تبدیل ہو گیا لیکن کچھ شعراء نے مرثیہ نگاری سے اپنا دامن وابستہ رکھا اور اس صنفِ شعر کے گلستاں کی خونِ دل سے پرورش کرتے رہے ۔

ان وابستگانِ شوق میں جوش ملیح آبادی، نجم آفندی، جمیل مظہری، آلِ رضا، نسیم امروہوی، سکندر مہدی آغا، قیصر بارہوی، وحید الحسن ہاشمی، شائق زیدی اور افسر عباس زیدی کے نام خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

جوش کے مرثیوں میں وہی گھن گرج اور دبدبہ و طنطنہ ہے جو ان کے دیگر کلام کا امتیازی وصف ہے ۔ ان کے مرثیوں میں جذبات نگاری و فکر انگیزی کے عناصر یکجا ہو گئے ہیں ۔ فکر انگیزی قاری کو

غور و فکر اور اصلاحِ احوال پر ابھارتی ہے اور جذبات نگاری دلوں کو مظلومینِ کربلا کی محبت و عقیدت سے سرشار کرتی ہے ۔

نسیم امروہوی کو موجودہ دور کے مرثیہ نگاروں میں بلند مقام حاصل ہے ۔ انہیں علم و ادب سے خصوصی شغف ہے ۔ انہیں روزمرّہ اور محاورات کے استعمال پر خصوصی عبور حاصل ہے ۔ ان کے مرثیے فصاحت و بلاغت، نکتہ آفرینی، فلسفیانہ طرزِ استدلال، رعایتِ لفظی اور جدید تشبیہات و استعارات سے مزیّن ہیں اور ان خصوصیات کے حامل ہیں جو لکھنوی شعراء کا طُرّۂ امتیاز ہیں ۔ منظر عباس نقوی لکھتے ہیں:

> " نسیم امروہوی کے مرثیوں میں اصلاحی عنصر ہر جگہ غالب ہے ۔ حرّیت، انقلاب، جہدِ حیات، جذبۂ عزم و عمل، اتحادِ ملّت، اسلام اور انسانیت ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں"۔ (۹)

قیصر بارہوی نے اردو مرثیے کی کلاسیکی روایات سے ہٹ کر ایک اسلوبِ خاص اپنایا ہے ۔ وہ حضرت امام حسینؑ اور قافلۂ کربلا کے تاریخی حقائق کے پس منظر میں موجودہ دور کے روح فرسا حالات کا جائزہ لیتے ہیں اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کا خواب دیکھتے ہیں جس میں امن، انصاف، رواداری اور احترامِ انسانیت کا دور دورہ ہو اور کوئی کسی کو ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنا سکے ۔ حسن عسکری کاظمی، قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> " قیصر بارہوی نے عصری مسائل کو سامنے رکھ کر مرثیہ کہنے کی طرح ڈالی ہے ۔ یہ ایسی کھُلی حقیقت ہے جسے ان کے ہر مرثیے کے تار و پود میں خونِ گرم کی طرح محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ وہ آج کے مسائل کا حوالہ، عصری جبریت کی نشان دہی اور اس سے پیدا ہونے والی قباحتوں کا بطورِ خاص اپنے مرثیوں میں اس طرح تجزیہ کرتے ہیں کہ وہ قاری یا سامع کو اپنا فکری ہم سفر بنا لیتے ہیں"۔ (۱۰)

موجودہ دور کے شعراء کی ایک معقول تعداد مرثیہ نگاری کے فروغ و ارتقاء کے لیے جوش و خروش سے سرگرمِ عمل ہے ۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ میر انیس کے بعد مرثیہ نگاری کا سفر رک گیا ہے ۔ قیامِ پاکستان کے بعد مرثیہ نگاروں نے نئی شعری تحریکوں اور جدید رجحانات کا بغور مطالعہ کیا ہے اور نئے مرثیے کو صوری و معنوی محاسن دیے ہیں ۔ بقولِ ڈاکٹر اسد اریب:

> " ہمارے خیالات کے نئے آفاق پر مرثیہ اب جدید زندگی کی روشن
> علامتوں ' نئے سیاسی اور سماجی استعاروں اور دھنک کی خوش رنگ
> لہروں کا ایک ایسا مرقع بن گیا ہے جو کہیں کہیں تو خود اردو نظم کے
> لیے بھی قابلِ رشک ہے "۔ (۱۱)

جدید مرثیہ نگاروں میں رئیس امروہوی ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں ۔ انہوں نے اگرچہ کئی اصنافِ سخن میں خامہ فرسائی کی ہے لیکن مرثیے کو انہوں نے ذوق و شوق سے اپنایا ہے ۔ صنفِ مرثیہ سے ان کے خصوصی شغف کی دو وجوہات ہیں ۔ پہلی خاندانی عقائد و نظریات کے حوالے سے ان کا اثنا عشری ہونا ہے ۔ اس لیے آئمۂ اہلِ بیت سے ان کی عقیدت فطری و موروثی ہے ۔ رئیس بچپن سے ہی امروہہ کی مجالسِ عزا اور محافلِ قصیدہ خوانی میں پابندی سے شریک ہوتے رہے ۔ ان محافل نے ان کے شوقِ مرثیہ خوانی و مرثیہ نگاری کو پروان چڑھایا اور ان کے قلم سے یادگار مرثیے وجود میں آئے ۔ بقولِ رئیس:

آج امروہے میں وہ ماہِ عزا کا اہتمام
وہ عزا خانے ' وہ پاکیزہ مجالس صبح و شام
وہ علم اللہ اکبر ' ان کا حسنِ انتظام
اہلِ امروہہ کو تھا دس روز تک صرف ایک کام
کربلا کی یاد میں اشکوں سے منہ دھوتے رہے
یا علم کے ساتھ دن بھر گشت یا روتے رہے

حوالہ جات

۱۔ سلام سندیلوی' ڈاکٹر' " ادب کا تنقیدی مطالعہ " لاہور: میری لائبریری ' ۱۹۶۳ء ' ص ۵۸ ' ۵۹

۲۔ اعجاز حسین' سیّد ' " نئے ادبی رجحانات " حیدر آباد دکن بھارت: نفیس اکیڈمی ' ۱۹۳۶ء ' ص ۳۸

۳۔ شبیہہ الحسن (دیباچہ) مشمولہ " آیاتِ آمنہ" (از قیصر بارہوی) لاہور: سفینہ پبلی کیشنز ۲۵۳۔ ایف رحمان پورہ' ۱۹۸۸ء ' ص ۱، ۲

۴۔ شبلی نعمانی ' " موازنۂ انیس و دبیر " لاہور: مجلس ترقیٔ ادب ' ۱۹۶۴ء ' ص ۹۸

۵۔ احراز نقوی' ڈاکٹر' " انیس ایک مطالعہ " لاہور: مکتبہ میری لائبریری ' ۱۹۸۲ء ' ص ۲

۶۔ حالی' الطاف حسین ' " مقدمۂ شعر و شاعری " کراچی: اردو اکیڈمی سندھ' سن ندارد' ص ۱۸۱

۷۔ طارق سعید ' " کلاسیکی اردو شاعری کی تنقید " علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس' ۱۹۹۱ء ص ۳۸۸

۸۔ ابوالکلام قاسمی ' " مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت " نئی دہلی: ایجوکیشنل بک ہاؤس ' ۱۹۹۲ء ' ص ۲۱۸

۹۔ منظر عباس نقوی' پروفیسر' " اسلوبیاتی مطالعے " علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس ' ۱۹۸۹ء ' ص ۱۸۶

۱۰۔ حسن عسکری کاظمی' پروفیسر' " قیصر بارہوی کے منفرد مرثیے " لاہور: حلقہ شعرائے اہل بیت ' ۱۹۹۰ء ص ۸ ' ۹

۱۱۔ اسد اریب' ڈاکٹر" اردو مرثیے کی سرگزشت " لاہور: کاروانِ ادب' ۱۹۸۹ء ' ص ۴

اردو قطعہ نگاری کے خدوخال

عموماً چار مصرعوں کی مختصر نظم کو قطعہ کہاجاتا ہے مگر شمیم احمد کے بقول "بعض لوقات قطعہ دو شعروں سے زائد بھی ہوتاہے۔ ایسے قطعے کے تمام مصرعے اور اشعارایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں" (۱)۔ اس کا عموماً دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے لیکن بعض اوقات پہلا مصرع بھی ہم قافیہ ہوتا ہے۔

موجودہ دور میں قطعہ چونکہ زیادہ تر چار مصرعوں کا ہی لکھا جا رہا ہے ' اس لیے بعض لوگ اسے غلطی سے رباعی کہہ دیتے ہیں۔ قطعے کا پہلا مصرع دوسرے اور چوتھے مصرعوں سے ہم قافیہ ہونا ضروری نہیں۔ جبکہ رباعی میں یہ تینوں مصرعے لازماً ہم قافیہ ہوتے ہیں۔

غزل کے شعر کی طرح قطعے میں بھی کسی ایک خیال یا جذبے پر مبنی مضمون مسلسل بیان کیاجاتا ہے۔ شعراء نے ہر موضوع پر قطعے لکھے ہیں۔ بیشتر قطعات اخلاقی و فلسفیانہ موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ قطعہ عربی زبان کی اصنافِ شعر سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر ایرانیوں نے اس کو اپنایا اور پھر اردو شعراء نے فارسی شعراءؔ کی پیروی کرتے ہوئے اس صنفِ شعر میں طبع آزمائی کی۔

اردو قطعہ نگاری کا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

"اردو میں قطعہ نگاری کے چار ادوار ہیں۔ پہلا دکنی دور جس کی نمائندگی نصرتی ' محمد قلی قطب شاہ ' عبداللہ قطب شاہ ' غواصی اور ولی وغیرہ کرتے ہیں۔

دوسرا دور شمالی ہند میں حاتم سے شروع ہو کر میرو سودا اور اس کے بعد حسن و مصحفی و انشاء سے ہوتاہوا ذوق وغالب پر ختم ہوتا ہے۔

تیسرا دور حالی سے شروع ہوتا ہے اور اقبال کی وفات کے لگ بھگ ختم ہو جاتا ہے۔ اکبر بھی اسی دور میں شامل ہیں۔ یہ قطعات کے انتہائی عروج کا دور ہے۔

چوتھے دور کا آغاز ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ ہوتا ہے اور آج تک جاری ہے"۔ (۲)

حالی نے قطعہ نگاری کی سرزمین میں نئے رجحانات کی تخم پاشی کی۔ ان کے قطعات نے اخلاقی و ملّی مضامین اور سادہ طرزِ بیان کی وجہ سے خاصی شہرت حاصل کی۔ ان کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو:

غرورِ زید کی کرتا ہے گر شکایت عمر
تو سمجھو کرتا ہے اپنے غرور کا اقرار
جنہوں نے آپ کو سب سے سمجھ لیا ہے بڑا
بڑائی دیکھ نہیں سکتے غیر کی زنہار (۳)

اکبر الٰہ آبادی نے مذہبی ' فلسفیانہ ' معاشرتی ' سیاسی اور تہذیبی موضوعات پر قطعہ نگاری کی ہے۔ ان کے بعض قطعات میں شوخی ' طنز اور ظرافت کا پہلو نمایاں ہے۔

اکبر نے ایک ماہر طبیب کی طرح اہلِ قوم کے عوارض کی تحقیق و تشخیص کی اور اپنے کلام کے ذریعے ان کا علاج تجویز کیا۔ وہ مغربی تہذیب کے ضرر رساں اثرات سے قوم کو بچانا چاہتے تھے۔ وہ مسلمانوں کی معاشرت، سیاست، تعلیم اور طرزِ حیات کو اسلامی اصولوں کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ جذبۂ خیر و اصلاح ان کی پوری شاعری پر محیط نظر آتا ہے ہمارے تمام قومی شعراء کے کلام میں یہی جذبہ کارفرما ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "شاعری کی امنگ سچ اور خیر ہی کے جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہے وہ شاعری کا جسم اور لباس ہے" (۴)۔ اکبر کو صرف مزاحیہ شاعر سمجھنا غلط ہے صرف ہنسنا ہنسانا ان کا مقصود نہیں۔ ان کا مقصد و منشاء صرف یہ ہے کہ بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو ان کی گمشدہ منزل مل جائے۔ "اکبر کی ظرافت ایک بلند تر مطمحِ نظر کی حامل ہے۔ اس ظرافت کی تہہ میں حکیمانہ ژرف بینی، عارفانہ نکتہ وری اور سنجیدہ غور و فکر کی لہریں ہیں جو اسے عام ظرافت سے بلند کرتی ہیں"۔ (۵)

اکبر نے اپنا مافی الضمیر دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ انہیں چونکہ زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے اس لیے ان کی ظرافت میں نہ صرف الفاظ کا حسن موجود ہے بلکہ افکار کی پختگی بھی بتمام و کمال نظر آتی ہے۔ اکبر کے اسلوبِ سخن کے بارے میں آل احمد سرور رقم طراز ہیں:

> "اکبر کی ظرافت کا حُسن ان کی مرصّع کاری، ان کی موزوں تشبیہات، ان کے قوافی، انگریزی الفاظ کے برمحل استعمال، ان کی علامات، اساتذہ کے اشعار میں بامزہ تصرّف اور ان کے نکھرے اور ستھرے اسلوب کا مرہونِ منّت ہے"۔ (۶)

شاد عظیم آبادی افکار و نظریات کے لحاظ سے اکبر الٰہ آبادی کے قبیلے کے فرد ہیں۔ ان کے قطعات میں بھی قومی زبوں حالی کا درد، اصلاحی فکر اور پند و نصائح پر مبنی خیالات ملتے ہیں۔

"منصبِ شاعری" کے عنوان سے ان کا ایک قطعہ دیکھیں:

اثر زیادہ ہو سامع پہ نثر کی نسبت
اسی لیے ہے فقط شعر و شاعری کی بناء
خلافِ فطرت و انسانیت ہے جو مضموں
تو اس میں قوّتِ جذبِ قلوبِ خلق کُجا

شاد کے قطعات کے بارے میں محمد ذکی الحق کی رائے ملاحظہ ہو:

> "شاد جب قطعہ لکھتے ہیں تو خاصا فلسفیانہ اور حکیمانہ لب و لہجہ اختیار کر لیتے ہیں ... سرسید اور حالی نے جس اصلاحی تحریک کی بنیاد ڈالی تھی، شاد عظیم آبادی اس اصلاحی تحریک کے ہم نوا تھے ... ۱۸۵۷ء کے بعد شاد پہلے شاعر ہیں جن کے کلام میں فلسفۂ عمل کی تعلیم ملتی ہے"۔ (۷)

علامہ اقبال نے بھی ملّی و اخلاقی موضوعات پر قطعے لکھے ہیں۔ یہ قطعات زیادہ تر ان کی کتاب ضربِ کلیم میں موجود ہیں۔ یہ قطعات تفکّر، بلند آہنگی اور رفعتِ خیال کے حوالے سے ہماری قومی شاعری کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔

اقبال کے قطعات بھی اکبر الٰہ آبادی کے قطعات کی طرح کثیر تعداد میں ہیں۔ اگرچہ اکبر اور اقبال میں خاصا فرق ہے لیکن تقلیدِ مغرب سے نجات، اسلامی اقدار کے احیاء اور جدید تعلیم کی سمّیت کے امور میں دونوں متّفق نظر آتے ہیں۔ اس گہری فکری مماثلت کی وجہ سے ہم اکبر کو اقبال کا پیش رو کہہ سکتے ہیں۔ جس طرح دیگر اصنافِ نظم و نثر میں احمد ندیم قاسمی نے دیہاتی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے اور کسانوں کے دکھ، سکھ اور زندگی کے مسائل کو منظرِ عام پر لائے ہیں ویسے ہی ان کے قطعات میں بھی ہمارے مقامی، سماجی اور ثقافتی مظاہر نظر آتے ہیں۔ جمیل ملک کا بیان ہے:

> "ندیم نے اپنے قطعات میں مقامی رنگ کے ساتھ فطرت کے مظاہر، رومان کی جلوتوں، کسانوں کی زندگی کے چھوٹے بڑے مسائل، ان

> کے آنسوؤں اور مسکراہٹوں کو اس طرح آمیز کیا ہے کہ ندیم کے
> اپنے گاؤں کے آئینے میں ملک کی پوری معاشرت اور اس کے
> پیداواری رشتوں کی تصویر کھنچ جاتی ہے"۔ (۸)

احسان دانش نے زندگی کے تلخ تجربات کو قطعات کی شکل میں پیش کیا ہے وہ دلکش تشبیہات و استعارات کے ذریعے دینی اقدار اور سماجی حقائق کو منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ وہ داخلی کیفیات سے زیادہ خارجی مشاہدات کو نوکِ قلم پر لاتے ہیں۔ دیگر قطعہ نگاروں میں اختر انصاری ' جوش ملیح آبادی اور رئیس امروہوی خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

دورِ حاضر میں قطعہ نگاری کے میدان میں اپنی خدمات کے حوالے سے رئیس ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے تقریباً ہر اہم موضوع پر قطعے لکھے ہیں اور اپنی قادرالکلامی کے جوہر دکھائے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ عظیم احمد ' " اصنافِ سخن اور شعری ہیئتیں " لاہور: مکتبۂ عالیہ اردو بازار ' ۱۹۸۳ء ' ص ۱۸

۲۔ محمد ذکریا ' ڈاکٹر ' " اکبرالہ آبادی ۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ " لاہور: مجلسِ ترقی ادب ' ۱۹۸۰ء ' ص ۳۱۸ ' ۳۱۹

۳۔ حالی ' الطاف حسین ' " قطعاتِ حالی " میرٹھ: ا لکتبۃ القادریہ لال کرتی ' سن ندارد ' ص ۵۶

۴۔ عبداللہ ' ڈاکٹر سید ' " اشاراتِ تنقید " لاہور: مکتبۂ خیابانِ ادب ' ۱۹۶۶ء ' ص ۳۲۸

۵۔ غلام حسین ذوالفقار ' ڈاکٹر ' " نقدِ اکبر " لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز ' ۱۹۷۲ء ' ص ۲۱

۶۔ آل احمد سرور ' " تنقید کیا ہے " کراچی: اردو اکیڈمی سندھ ' ۱۹۵۴ء ص ۶۳ ' ۶۵

۷۔ ذکی الحق ' محمد ' " ذکر و مطالعہ " پٹنہ: کتاب منزل ' ۱۹۵۹ء ' ص ص ۱۳۸ ' ۱۳۰

۸۔ جمیل ملک ' " ندیم کی شاعری ۔ فکر ' فن ' شخصیت " راولپنڈی: نوید پبلشرز پراچہ سٹریٹ ' ۱۹۷۲ء ' ص ۲۷

اردو افسانے میں علامت کا استعمال

اردو افسانے کو موجودہ منزل تک پہنچنے کے لئے بہت سے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا ہے۔ بالخصوص علامتی افسانے نے اپنے تاثر آفریں کردار کی وجہ سے قاری پر اپنی شناخت کے انوکھے در وا کئے ہیں۔

سیدھے سادے انداز میں دوسروں تک اپنے خیالات کی ترسیل ابلاغ کے حوالے سے زیادہ موثر نہیں ہوتی۔ اشارے، کنائے اور علامت کے ذریعے تحریر زیادہ موثر اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ علامتی انداز انسان کے فطری جذبہ تجسس کو ابھارنے اور جذبوں کی تسکین کے لئے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ رویائے صادقہ (سچے خواب) کا علامتی اسلوب انسانی ذہن سے قریب تر اور تفہیم مطالب کے لئے موثر ترین ذریعہ ہوتا ہے۔ قدرت ہمیں بعض حوادث سے بچانے کے لئے خوابوں کے ذریعے ہوشیار کرتی ہے تاکہ ہم قبل از وقت کسی ممکنہ پریشانی سے مطلع ہو کر مناسب انداز سے اپنا لائحہ عمل تبدیل کر لیں۔

مثال کے طور پر عالم بیداری میں اگر کوئی دشمن ہمارا تعاقب کرے تو ہم اسے معمولات زندگی کا ایک حصہ سمجھ کر جزوی و سرسری اہمیت دیتے ہیں۔ اگر خواب میں بھی ہمیں وہی شخص تعاقب کرتا ہوا نظر آئے تو وہ خواب بھی ہمارے معمول کا حصہ ہوگا اور ہم سوچتے ہیں کہ چونکہ بیداری کی حالت میں ہم نے دشمن کو تعاقب کرتے دیکھا ہے، اس لئے وہی خیالات خواب کے روپ میں ڈھل کر سامنے آگئے ہیں۔ اس طرح ہم ایسے خواب سے کوئی خاص مفہوم اخذ نہیں کرتے۔ لیکن اگر ہمیں خواب میں کوئی سانپ یا کتا اپنے پیچھے دوڑتا ہوا نظر آئے تو ہم اس سے زیادہ متاثر اور خوف زدہ ہوتے ہیں۔ جب ہمیں اس خواب کی یہ تعبیر بتائی جاتی ہے کہ کوئی دشمن اپنا وار کرنا چاہتا ہے یا کوئی مصیبت آنے والی ہے تو ہم زیادہ ہوشیار اور چوکنے ہو جاتے ہیں۔

قدرت کا یہ علامتی انداز تفہیم چونکہ انسان کے فطری احساسات کا مزاج داں ہے اس لئے سنجیدہ و حساس طبائع اسے جلد قبول کر لیتی ہیں اور پھر ان اشارات غیب کے اثرات بسرعت معمولات زندگی پر مرتب ہونے لگتے ہیں۔ تخلیق کار شاعر ہو یا نثر نگار اسی رمزیہ و ایمائی اسلوب کو جب اپنی تحریروں میں منعکس کرتا ہے تو وہ زیادہ اثر آفریں، سحر انگیز، دل افروز اور خرد آموز ہو جاتی ہیں۔ جمالیاتی و وجدانی فضا میں تخلیق

ہونے والا ادب روح کی گہرائیوں میں اترنے کی استعداد رکھتا ہے۔

زبان میں روزمرہ، محاورات، ضرب الامثال، تشبیہات، استعاروں اور مجاز مرسل وغیرہ کا استعمال علامت نگاری ہی تو ہے۔ ہم اپنے جذبات و احساسات کو علامات کے ذریعے نمایاں کرتے ہیں۔ مثلاً دل ڈوبنا، دل بیٹھنا، نبض ڈوبنا، سانس اکھڑنا، باغ باغ ہونا، آگ بگولہ ہونا وغیرہ - علامتی اسلوب میں کیفیات کے موثر اظہار کی یہ چند مثالیں ہیں۔

اس لئے علامتی افسانے کا ادب اور معاشرے کے حوالے سے جائزہ لیں تو ہمیں اس کی افادیت، ضرورت اور اہمیت کا شدت سے احساس ہونے لگتا ہے۔ دیگر اصناف ادب کی طرح اگر علامت نگاری کی جمالیاتی توانائی کو افسانہ نگاری میں ڈھنگ سے استعمال کیا جائے تو یہ اس صنف سخن کو رفعت آفریں تخلیقی معجزہ بنا سکتی ہے۔

لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ علامتی افسانہ نگاری کے علمبرداروں کی اکثریت نے اردو زبان کے مروجہ سانچوں کی توڑ پھوڑ اور عجز بیان کو کمال ہنر سمجھ لیا۔ اس علامت زدگی سے اردو زبان کے فلک بوس ایوان کھنڈرات میں تبدیل ہونے لگے ہیں۔ دنیا کی کوئی زبان بھی دریائے بیاں کی فطری اور قدیم گزرگاہوں پر بند باندھ کر اپنے علمی، فکری اور تخلیقی جوہر کا اظہار نہیں کر سکتی۔

ادب کسی بھی معاشرے کے سیاسی، ثقافتی، مذہبی اور سماجی میلانات کی تصویر کشی کرتا ہے لیکن اگر کسی گروہی مقصد کو پورا کرنے کے لئے اسے صرف جنس، بھوک اور ظلم کے پامال اور فرسودہ موضوعات تک محدود کر دیا جائے اور دیگر تمام مسائل کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ بھی تنگ نظری اور خود کو ایک خاص حصار میں مقید کر دینے والی بات ہے۔ جہاں مادی حوائج انسان کی جسمانی نشوونما کے لئے ضروری ہیں ویسے ہی روحانی ضروریات بھی ایک اٹل حقیقت ہیں۔ اس لئے جہاں انسانی زندگی کے مادی پہلو ادب کے اہم موضوعات ہیں وہاں اخلاقی اقدار پر مبنی عنوانات بھی ایک ناگزیر ضرورت ہیں۔

آج کا علامتی افسانہ نگار ایک خاص طبقے کا منظور نظر بننے اور شہرت کی دیوی کے حصول کی تمنا میں صداقت، انصاف، نیکی اور دیگر عالمی اقدار پر مبنی موضوعات سے دانستہ کنارہ کش ہو گیا ہے۔ حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ تعصب، حسد، نفرت، انتقام، بداطواری وغیرہ جسد انسانیت کے لئے مہلک امراض کی حیثیت رکھتے

ہیں۔ ان ہلاکت آفریں ہتھیاروں نے عالمی اقدار کی ترویج کے ارتقائی عمل کو ہولناک انجام سے دوچار کردیا ہے۔

اس صورت حال میں آج کے بیشتر علامتی افسانہ لکھنے والے ادیب' ادب اور معاشرے کے لئے اپنا یادگار کردار ادا کرنے کی بجائے کنویں کے مینڈک بن کر ایک محدود فضا میں قید ہوچکے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب شکستہ پا زبان اور مفلوج موضوعات کا سہارا لیا جائے گا۔ تو اس کا منطقی نتیجہ یہی نکلے گا کہ ہر علامتی تحریر پیچیدہ ہو کر بے معنویت کا شکار ہو جائے گی اور قاری ابہام کے خارزاروں میں بھٹک کر منزل سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ آج کے دور میں اگر کوئی افسانہ نگار علامت کے ذریعے زندگی کی کوئی صداقت ہم پر منکشف کرنا چاہتا ہے تو اسے زبان و بیان - دونوں کے حوالے سے ابلاغ کی ضرورتوں کا خیال رکھنا ہوگا اور زندگی کے تمام حقائق کی بغیر کسی مصلحت' منافقت اور تعصب کے عکاسی کرنا ہوگی۔ تاکہ علامت نگاری' ذہنی پراگندگی کا باعث بننے کی بجائے فکری شیرازہ بندی کر سکے اور قوم کے اذہان عروج و ارتقاء کی منزل کی طرف گرم سفر ہوسکیں۔

رئیس امروہوی کے شخصی و فنی کمالات

ممتاز ادیب، شاعر اور صحافی رئیس امروہوی بیسویں صدی کے اوائل میں شمالی ہند کے قصبے امروہہ کے ایک علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے پردادا، دادا اور والد عمر بھر دامنِ شعر و سخن سے وابستہ رہے۔ رئیس کے والد سید شفیق حسن ایلیا ایک جیّد عالم، فلسفی، شاعر اور محقّق تھے۔ "معراجِ نفسِ رسولؐ" ان کا یادگار شعری مجموعہ ہے۔

جہاں والدین کی تربیت اور گھر کے علمی و ادبی ماحول نے رئیس کی جذباتی و فکری رہنمائی کی وہاں اس دور کے روایتی گھریلو مکتب میں ان کے ابتدائی تعلیمی مراحل کی تکمیل ہوئی۔ بعد ازاں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے منشی اور منشی فاضل کے امتحانات بھی پاس کر لیے۔ رئیس جب جوانی کے دور میں داخل ہوئے تو ان کی شعری و ادبی صلاحیتیں بھی منظرِ عام پر آنے لگیں اور ان کے مخفی جوہر نمایاں ہوئے۔ ۱۹۳۴ء کو رئیس کی ان کی پھوپھی زاد بہن ہاشمہ سے شادی ہوئی۔ وہ بیگم سے ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے باوجود عائلی زندگی کے فرائض عمر بھر خوش اسلوبی سے نبھاتے رہے۔ بیگم رئیس کے بطن سے پانچ صاحبزادیاں ریحانہ، صالحہ، شاہانہ، فرزانہ اور خیزران پیدا ہوئیں۔ کوئی فرزند پیدا نہ ہوا۔ رئیس نے گیارہ سال کی عمر میں مندرجہ ذیل اشعار سے شاعری کا آغاز کیا:

جب طبیعت میری گھبراتی ہے
دل وہی کو تیری یاد آتی ہے
وائے حسرت کہ تلاشِ منزل
دربدر ٹھوکریں کھلواتی ہے
یا تو کچھ میں ہی غلط سمجھا ہوں
یا حقیقت میں بہار آتی ہے

رئیس فنِ شاعری میں اپنے والد سید شفیق حسن ایلیا کے شاگرد تھے۔ برِصغیر کی تقسیم سے قبل انہوں نے کچھ اخبارات و جرائد کی ادارت سے صحافتی سفر شروع کیا اور قیامِ پاکستان کے بعد کراچی آکر شاعری، ادب، روحانیات اور جنسیات وغیرہ کے حوالے سے ادبی و ادارتی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران ان کے ملّی نغمے خاصے مقبول ہوئے۔

تقسیمِ ہند سے قبل رئیس کی پہلے کانگریس اور پھر مسلم لیگ میں شمولیت نے انہیں سیاسی شعور عطا کیا اور انہوں نے تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس دور میں ان کا یہ شعر بچے بچے کی زبان پر تھا۔

یاد رکھنا! وقت کا فرمان ٹل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے پاکستان ٹل سکتا نہیں

قیامِ پاکستان کے بعد بھی رئیس کے سیاسی رہنماؤں سے روابط، احباب، کالم، قطعات، منظومات اور دیگر معمولات ان کی سیاست سے گہری وابستگی کے آئینہ دار ہیں۔

رئیس عمر بھر علمی، ادبی، فلاحی اور سماجی انجمنوں کی سرپرستی کرتے رہے۔ کچھ تعلیمی ادارے بھی ان کی معاونت و مشاورت سے قائم ہوئے۔ ان اداروں میں پاک اورنٹیل کالج خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے ۱۹۷۴ء میں مخیر و متموّل لوگوں کے مالی تعاون سے مہاجرین کے لیے تین رہائشی سکیمیں

بنائیں۔ (۱) رئیس امروہوی نگر (۲) گلشنِ رئیس (۳) رئیس امروہوی ٹاؤن شپ۔

رفاہی کاموں کے ساتھ ساتھ رئیس قطعہ نگاری کے ذریعے عوامی مسائل کو احاطۂ تحریر میں لائے۔

اگرچہ انہوں نے ۵ جون ۱۹۴۷ء سے قطعات لکھنے شروع کیے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد ۳۱ جنوری ۱۹۴۸ء سے ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء تک روزنامہ "جنگ" کراچی میں سیاسی، سماجی، تاریخی، ثقافتی، مذہبی، اخلاقی اور نفسیاتی موضوعات پر روزانہ ایک قطعہ لکھتے رہے۔ ان قطعات میں بے شبہ پاکستان کی ملّی تاریخ نظم کردی گئی ہے۔

۱۹۸۸ء کے اوائل میں ان کے مدّاحوں نے پاک ادب سوسائٹی ابوظہبی کے زیرِ اہتمام "جشنِ رئیس" منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ اس تقریب کا انعقاد جنوری یا فروری ۱۹۸۹ء کو ہونا تھا۔ لیکن ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء کو کسی شقی القلب نے گولی مار کر رئیس کی زندگی کا چراغ گُل کردیا۔

راقم الحروف جب رئیس سے ملا تو ان کی شخصیت کی وجاہت سے خاصا متاثر ہوا۔ ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔ آواز بھاری اور گرج دار، لہجے میں حلاوت، کشادہ پیشانی، گورا رنگ، دراز قامت، سفید کرتہ اور کھلی موہری کا پاجامہ زیبِ تن۔

رئیس ذہنی و جسمانی لحاظ سے بچپن سے عالمِ پیری تک درست و چست رہے۔ وہ چونکہ علمِ طب سے واقف تھے۔ اس لیے انہوں نے تمام عمر زُہد، عادات اور جسمانی تقوے کو پیشِ نظر رکھا۔ وہ خطوں کے جواب اپنے ہاتھوں سے تحریر کیا کرتے۔ صبح سویرے ورزش اور مشقِ تنفسِ نور کرنا ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔

وہ رند مشرب ہونے کے باوجود عادتِ رندی کو ہمیشہ معیوب و ضرر رساں کہتے رہے۔ انہوں نے جدید و قدیم علوم کا وسیع مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے ان کی نگارشات میں ادبی شکوہ اور علمی وقار نظر آتا ہے۔ انہوں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ عمر بھر جاری رکھا۔ حلقۂ تعارف وسیع ہونے کی وجہ سے ان کی کتب باآسانی فروخت ہو جاتی تھیں۔ مشرقی ماحول میں پیدا ہونے کی وجہ سے رئیس کی شخصیت وسیع النظری، حُسنِ خلق اور کشادہ دلی کے اوصاف سے متصف تھی۔ ان کے چہرے سے اگرچہ متانت ٹپکتی تھی لیکن ظریفانہ نکتہ آفرینیوں سے جانِ محفل بنے رہتے تھے۔ ان کے لباس، غذا، انداز و اطوار اور دیگر معمولاتِ زندگی

پر ہمیشہ سادگی و درویشی کا رنگ غالب رہا۔ اللہ کے بندوں کی دستگیری و دل جوئی کو انہوں نے اپنا مقصدِ حیات بنالیا تھا۔ چنانچہ نفسیات اور شاعری کے حوالے سے انہوں نے ہزاروں افراد کی رہنمائی کی۔

رئیس کی سیرت میں وہ ہمہ پہلو صفات موجود تھیں جو کسی عظیم شخصیت کی شناخت ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شخصی محاسن اور علمی و ادبی خدمات کو نہ صرف زندگی میں سراہا گیا بلکہ موت کے بعد بھی خراجِ تحسین پیش کیا جا رہا ہے۔ رئیس کی نفسیات ' ادبی نثر ' شاعری اور تراجم کے حوالے سے ستائیس کتب طبع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے بعض کتب کئی جلدوں میں ہیں۔ نفسیاتی کتب ' ذہنی و جنسی مسائل ' مراقبات ' ہپناٹزم ' حاضراتِ ارواح ' عالمِ برزخ ' جنّات اور نفسیاتی طریقہ ہائے علاج کے موضوعات پر مبنی ہیں۔ ادبی موضوعات پر مشتمل نثری کتب میں ہمارے معاشرتی و قومی بحرانوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ انہوں نے شعری مجموعوں میں بیشتر اصنافِ شعر پر طبع آزمائی کی ہے۔ ہندی اور فارسی نثری کتب کے اردو تراجم ان کے مختلف زبانوں پر عبور اور فنِ ترجمہ پر گرفت کو ظاہر کرتے ہیں۔

امروہہ کی ادب پرور فضا ' والد کے علمی و روحانی مشاغل اور باطنی علوم کا مطالعہ ایسے عوامل تھے جو رئیس کی علمِ نفسیات سے وابستگی کا باعث بنے اور انہوں نے ۱۹۶۴ء میں ادارہ معین (من عرف نفسہ) قائم کر دیا جس کا مقصد لوگوں کے نفسیاتی امراض دور کرکے انہیں ذہنی و جسمانی لحاظ سے متوازن سطح پر لانا تھا۔ انہوں نے " جنگ " اور " عالمی ڈائجسٹ " میں نفسیات و مابعد النفسیات کے موضوع پر ہفتہ وار مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔

چنانچہ بعض نفسیاتی مریضوں نے مراسلت اور بعض نے ملاقاتوں کے ذریعے ان سے ہدایات حاصل کیں۔ رئیس کی بارہ نفسیاتی کتب میں ان مریضوں کے تجربات و مشاہدات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کی نفسیات نگاری اگرچہ علمِ نفسیات کے روایتی معیار پر پوری نہیں اترتی لیکن اپنی افادیت کی وجہ سے نظرانداز نہیں کی جا سکتی۔

رئیس نے اشتراکیت ' رومانیت اور ترقی پسندی کی تحریک کے زمانے میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔

وہ ان سے متاثر ہوئے پر ان میں شامل نہ ہوئے۔ اس کی وجہ گردوپیش کا وہ ماحول تھا جو ادبی کلاسیکی روایات کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ رئیس کے بیشتر افسانے المیہ ہیں اور معاشرے کے پسے ہوئے مظلوم طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عمدہ کردار نگاری ' اثر آفریں مکالمے ' ایمائیت ' لفظی شکوہ اور فکر انگیز اسلوب ان افسانوں کے اہم خصائص ہیں۔ رئیس کے افسانے تعداد میں کم ہونے کے باوجود اپنی اہمیّت اور معیار کی وجہ سے انہیں بطورِ افسانہ نگار زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

رئیس نے ۱۹۴۰ء سے قیامِ پاکستان تک ڈرامہ نگاری کی۔ ان ڈراموں میں بیشتر ماہنامہ "مسافر" مراد آباد میں شائع ہوئے۔ یہ ڈرامے چونکہ مشرقی ماحول میں لکھے گئے اس لیے ان میں سماجی روایات اور معاشرتی مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ رئیس کے ڈراموں کے پلاٹ ترتیب مواد کے اعتبار سے مربوط و منظّم ہیں۔ کردار ' واقعات اور حادثات تسلسل سے نقطۂ عروج کی طرف بڑھتے ہیں اور ڈرامائی کیفیت پیدا کر کے قاری کو متحیّر کر دیتے ہیں۔ رئیس غیر ضروری سنسنی پیدا کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اسی لیے ڈرامے کا انجام بھی پیش آمدہ حالات و واقعات کا منطقی نتیجہ ہوتا ہے۔ عمدہ زبان و بیاں نے مکالموں میں تاثیر و عمل کا افسوں پھونک دیا ہے۔ "شکستِ ناز" روشنی ' آپ کی مرضی اور "گلاب کا پھول" کا رئیس کے بہترین ڈراموں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

رئیس کے طنزیہ مضامین زیادہ تر سماجی ناہمواریوں ' شخصیات ' معاشرتی روایات اور انسانی روّیوں سے متعلّق ہیں۔ ان کی علامتی اسلوب کی سادہ وپُرکار تحریروں میں طنز کا ایک مخصوص انداز ملتا ہے۔ ان کا تخیّلی کردار " نواب اچھے مرزا " ایک ایسا جاندار کردار ہے جس نے طنز و مزاح کے روپ میں معاشرتی معائب اور موجودہ سیاست کی خامیوں کو بڑے فنکارانہ انداز سے بے نقاب کیا ہے۔

رئیس کے ادبی مضامین میں عصری تقاضوں ' اردو اصنافِ سخن ' علمی و ادبی شخصیات اور ادبی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ سخن پارے بامحاورہ زباں ' سادگیٔ بیاں ' اثرانگیزی ' رمزیہ و اشاری اسلوب ' نظم و ضبط اور پختہ افکار کے حوالے سے اردو نثر میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

ان کے تنقیدی مضامین میں شعریت ' علمیت اور فنّی بصیرت نمایاں ہے ۔ وہ موضوع سے قبل اس کا پس منظر واضح کرتے ہیں ۔ ان کے بعض مضامین کے تمہیدی حصّوں کی غیرضروری طوالت نے تحریروں کو متوازن نہیں رہنے دیا ۔ رئیس تنقیدی اصطلاحات اس سلیقے سے استعمال کرتے ہیں کہ قاری کو مفہوم سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی ۔

رئیس نے ۱۹۳۰ء میں صحافتی زندگی کا آغاز کیا ۔یہ دور سیاسی ' سماجی اور ادبی تحریکوں کے لحاظ سے انقلاب انگیز و ہنگامہ پرور تھا ۔ وہ اسی دور میں ادارت و اداریہ نویسی کے حوالے سے صحافت سے وابستہ ہوئے ۔ وہ ماہنامہ " مسافر" مراد آباد اور کراچی کے ہفت روزوں " غالب" اور " شیراز " میں مدیر و اداریہ نویس کے طور پر خدمات سرانجام دیتے رہے ۔ ان کے اداریوں کے بیشتر موضوعات ملکی و بین الاقوامی حالات ' سماجی مسائل ' مصنوعات ' نئی تصنیفات اور دواخانوں کے تعارف پر مشتمل ہیں ۔ رئیس کی صحافتی تحریریں ' سیاسی ' سماجی ' ثقافتی ' ادبی ' نفسیاتی اور روحانی موضوعات پر مبنی ہیں ۔ انہوں نے عمر بھر اپنے مضامین اور کالموں میں قومی مسائل ' سیاسی حالات اور مشرقی اقدار کی پامالی کو موضوعِ سخن بنایا اور کبھی سنجیدہ اور کبھی طنز و مزاح کے روپ میں کھل کر اظہارِ خیال کرتے رہے ۔ رئیس نے عام آدمی کے مصائب کو اربابِ اقتدار تک پہنچانا اپنا اوّلیں فرض سمجھا ۔ وہ روزنامہ "جنگ" اور دیگر رسائل کے کالموں اور مضامین کے ذریعے اس قلمی جہاد میں تاحیات مصروف رہے ۔

رئیس کے نفسیاتی مضامین زیادہ تر نفسیاتی مریضوں کے خطوط کے جائزوں پر مشتمل ہیں ۔ ان جائزوں میں وہ مسائل کی نوعیت اور اسباب کے بارے میں مدلّل بحث کر کے علاج تجویز کرتے ہیں ۔ جو مضامین اس انداز سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں ان میں محقّقانہ رنگ نمایاں ہے ۔ ان نفسیاتی مضامین پر علمیت کے ساتھ ساتھ ادبیت کی چھاپ دکھائی دیتی ہے ۔

رئیس کے خطوط ہمیں ان کی جذباتی و نفسیاتی کیفیات ' عادات و اطوار اور خیالات و عقائد سے آگاہ کرتے ہیں ۔ انہوں نے زندگی میں اندازاً دو لاکھ خطوط لکھے ۔ چونکہ ان کے حلقۂ تعارف میں کئی نسل '

مذہب ' زبان ' فرقے اور پیشے کے لوگ شامل تھے اس لیے خطوط کی یہ کثیر تعداد باعثِ حیرت نہیں ۔ مرزا غالب کی طرح ان کے خطوط میں بھی علالت و ضعفِ پیری کا بار بار ذکر کیا گیا ہے ۔ ان کے سفارشی خطوط میں مخیّر لوگوں کو ضرورت مندوں کی امداد کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ مکاتیبِ رئیس میں مہاجرینِ بنگلہ دیش اور بہاریوں کے بے آسرا خاندانوں کی بحالی و آبادکاری کی تفصیلات بھی ملتی ہیں ۔ رئیس کو اپنی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے مکتوبات میں علمی و ادبی مباحث پیش کرنے کا بہت کم موقع ملا ہے ۔ ان کے بعض خطوط میں زندہ دلی ' شگفتہ مزاجی ' شوخی اور ظرافت کے نمونے بھی موجود ہیں ۔ رئیس کو رمز و ایماء کے پردے میں داخلی و خارجی حالات کی عکّاسی کرنے میں کمال حاصل ہے ۔ وہ غیر ضروری لفّاظی سے پرہیز کرتے ہیں اور سادہ و مختصر جملوں میں اپنا مدّعا ظاہر کر دیتے ہیں ۔ عوامی رابطے کے حوالے سے رئیس کے مکتوبات ' فنِّ مکتوب نگاری کی انوکھی مثال ہیں ۔

رئیس نے نثر کی طرح شاعری میں بھی تخلیقی صلاحیّتوں کا بھرپور اظہار کیا۔ وہ اگرچہ شاعری میں اپنے والد کے شاگرد تھے لیکن جوش ملیح آبادی اور جگر مراد آبادی سے بھی متاثّر تھے ۔ ان کے موروثی ادبی خصائص ' مطالعے اور شعری صلاحیّتوں نے یکجا ہو کر سب سے پہلے غزل کے کوچے میں قدم رکھا۔ ۱۹۳۱ء میں ان کی پہلی غزل منظرِ عام پر آئی ۔ اس کا مطلع دیکھیں:

قصّہ نہ پوچھ مجھ سے شبِ انتظار کا
ہر اشک آئینہ ہے مِرے حالِ زار کا

رئیس نے غزل کو قدیم روایات اور مخصوص موضوعات تک محدود نہیں رکھا بلکہ ندرتِ تخیّل سے اسے نیا رنگ عطا کیا ' جس میں روایتی محبوب ' حسن و عشق ' کاکل و رخسار ' وصل و فراق اور آہ و فغاں کے ساتھ ان کے اپنے عہد کے سماجی ' عمرانی ' معاشی ' تہذیبی اور فکری رویّے موجود نظر آتے ہیں ۔ غمِ جاناں ہو یا غمِ دوراں ' ان کے اشعار میں تغزّل کی روح رواں دواں نظر آتی ہے ۔ رئیس کے طنزیہ اشعار میں گہرائی ' وسعت ' فکرانگیزی ' شوخی اور متانت کے عناصر نمایاں ہیں ۔ ان کے نفسیاتی اشعار کربِ

جذبات ' ذہنی اضطراب اور خیالات کے فشار کی عکّاسی کرتے ہیں ۔ غم انگیز کیفیات کی عکّاسی کے ساتھ انہوں نے اردو غزل کو رجائیت سے معمور افکار دے کر عزم و عمل کی توانائی بھی عطا کی ہے ۔ رئیس کے اشعار میں تلاش و جستجو کے ذریعے حقیقتِ کُل کو پا لینے کی شدید آرزو نظر آتی ہے ۔ عقلیت پسندی کے باوجود تذبذب اور تشکیک نے ان کے بعض اشعار کو مبہم بنا دیا ہے ۔

تکرارِ لفظی ' فلسفیانہ اسلوب ' نادر تشبیہات کے استعمال اور شائستہ و شُستہ زبان کے حوالے سے رئیس کی غزل ان کی انفرادیتِ فکر اور کمالِ فن کا ثبوت ہے ۔ ان کی غزلیات کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یوں لگا جیسے کہ بل کھا کے دھنک ٹوٹ گئی
اس نے وقفہ جو لیا ناز سے انگڑائی میں

گردشِ وقت بھی آگے مجھے لے جا نہ سکی
تم جہاں چھوڑ گئے تھے میں وہیں ہوں اب تک

خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم
گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم

بے ذوقِ حیات جی رہا ہوں
سقراط ہوں زہر پی رہا ہوں

رئیس نے نظم گوئی سے بھی خاصی شہرت پائی ہے۔ انکے والد چونکہ دینی و اصلاحی نظمیں لکھتے تھے۔ اس لیے رئیس پر بھی ان کے فکری اثرات ہوئے اور انہوں نے حمد ' نعت اور منقبت کو وسیلہ اظہار بنایا۔ ان کا یہ کلام رفعتِ مضامین اور عمدگیٔ اسلوب کا حسین امتزاج ہے ۔ نمونۃً اشعار دیکھیں:

یہ دعا مانگتے ہیں شام و سحر
اے خدائے بزرگ اے داور
اے خداوندِ انفس و آفاق
زہرِ آفات کو بنا تریاق

جلوۂ عارضِ نبی رشکِ جمالِ یوسفی
سینہ بسینہ سر بہ سر چہرہ بہ چہرہ ' ہو بہو

اے حسینؑ! اے وقت کی تاریکیوں میں شمعِ نور
اے حسینؑ! اے سرمدی طاقت کے نورانی ظہور
تیرا ذکر اسلام کی روحِ رواں ہے آج بھی
تیرا غم تاریخ کی نبضِ تپاں ہے آج بھی

رئیس کی ملّی نظموں کا آغاز تحریکِ پاکستان سے ہوا۔ بعد ازاں ان کا یہ سلسلۂ سخن عمر بھر جاری رہا۔ انہوں نے ان نظموں میں ایک طرف تو قائدِ اعظمؒ ' لیاقت علی خانؒ ' علامہ اقبالؒ اور دیگر مشاہیرِ علم و ادب کے کارنامے بیان کر کے انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور دوسری طرف معاشرے کے تلخ اور سنگین حقائق کو بے نقاب کیا ہے ۔ ان کی فلسفیانہ و نفسیاتی منظومات اگرچہ افکار کے حوالے سے انتشار اور بے ترتیبی کا شکار نہیں لیکن یہ منظومات جب رمزیہ و تشبیہی اسلوب کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں تو ابہام و بے معنویت کو جنم دیتی ہیں ۔ مجموعی طور پر رئیس کی ملّی نظمیں 'سماجی شعور اور تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت اور دورِ جدید کے مسائل کی خوبصورت عکّاسی کرتی ہیں ۔ اُسلوب کے لحاظ سے یہ نظمیں نُدرتِ قوافی ' خوبصورت تشبیہات و استعارات روانی و بے ساختگی اور چُست بندشوں کی وجہ سے ان کے کلام کا

سنگسار ہیں ۔ نمونے کے طور پر رئیس کے چند اصلاحی اشعار ملاحظہ ہوں:

قرآن کے مطالب سینوں میں ہیں ہمارے
ہم اس کے ترجماں ہیں وہ ترجماں ہمارا
بزمِ ازل میں ہم نے وحدت کے گیت گائے
طُوبیٰ کی ڈالیوں پر تھا آشیاں ہمارا
بدر و احد سے ظاہر اپنی شجاعتیں ہیں
خیبر سے جا کے پوچھو نام و نشاں ہمارا

اگرچہ کلامِ رئیس پر تفکّر و تعقّل کا رنگ محیط ہے اور وہ عقل کی بالادستی کے قائل ہیں لیکن ان کی رومانی نظموں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ انسانی جذبات کی ضرورت و اہمیت سے بھی نافل نہیں ۔ انہوں نے اختر شیرانی کے تتبع میں اپنی تخیلاتی محبوباؤں سلمیٰ ' ریحانہ اور عذرا سے معاملاتِ حسن و عشق کے رنگا رنگ موضوعات نظم کیے ہیں ۔ ان موضوعات میں عشق ' جذبات نگاری ' وصال ' راز و نیاز ' سراپا نگاری اور منظر نگاری ان کی فنّی ریاضت کا منہ بولتا ثبوت ہیں ۔ رئیس کے سوزِ عشق سے معمور غم انگیز اشعار رُلاتے اور تڑپاتے نہیں بلکہ دل میں ہلکی سی کسک پیدا کر دیتے ہیں ۔ خصوصاً جذبہ و فکر کا امتزاج رئیس کی نظموں کی شناخت ہے ۔ عشقیہ جذبات اور فکر انگیز میلانات نے ان رومانی نظموں کو دھوپ چھاؤں کے منظر کی طرح دل آرا و نظرنواز کر دیا ہے ۔ رئیس فلسفیوں کی طرح حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے سوچتے ہیں کہ محبت میں ناکامی کے اسباب کیا ہیں ؟ محبوب مجھ سے گریزاں کیوں ہے ؟ گوہرِ مقصود کیسے حاصل ہو گا ؟ اس استفہامیہ و مکالماتی انداز نے کلامِ رئیس میں گہری معنویت پیدا کر دی ہے ۔ مرصّع زباں اور صنائع و بدائع کے برمحل استعمال نے لکھنوی شعراء کی یاد تازہ کر دی ہے ۔ علاوہ ازیں تاثّر آفرینی ' سرمستی و وارفتگی ' جمالیاتی عنصر ' تسلسل اور عمدہ تراکیب سے رئیس کی رومانی نظمیں لطیف و شیریں ہو گئی ہیں ۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

گزرتا ہے کبھی جب چودھویں کا چاند بدلی سے
مہین آنچل میں ان کا روئے تاباں یاد آتا ہے
اندھیری رات میں جگنو چمکتے ہیں تو رہ رہ کر
دوپٹے کے ستاروں کا چراغاں یاد آتا ہے
کلی کو پھول بنتے دیکھ کر عہدِ بہاراں میں
کوئی چہرہ بہت نوخیز و خنداں یاد آتا ہے

مخصوص موضوعات کے علاوہ دیگر عام موضوعات پر بھی رئیس نے خاصی نظمیں لکھی ہیں ۔ ان نظموں میں بھی انہوں نے زبان و بیاں کے جلوے دکھا کر اپنا معیار و وقار برقرار رکھا ہے ۔

رئیس کی شاعری کا ایک اہم پہلو ان کی قطعہ نگاری ہے ۔ اس صنف سے فطری مناسبت ہونے کی وجہ سے انہوں نے اس میں قدرتِ زبان و بیاں کے خوب جوہر دکھائے ہیں ۔ انہوں نے ان قطعات میں برصغیر کے سیاسی واقعات محفوظ کر دیے ہیں ۔ یہ قطعات قیامِ پاکستان سے قبل انگریزوں اور ہندوؤں کی سازشوں ' مسلمانوں کی آزادی کے لیے پُرجوش کوششوں ' ۱۹۴۷ء کے خونیں فسادات میں لاکھوں انسانوں کے قتلِ عام اور قیامِ پاکستان کے بعد مہاجرین کے مسائل ' سیاسی صورتِ حال اور قومی حوادث کی مکمل عکّاسی کرتے ہیں ۔ ہر دور میں رئیس کے خلّاقانہ و بصیرت یافتہ ذہن پر پاکستان کے مجموعی حالات اثر انداز ہوتے رہے ہیں اور وہ اپنے ردِّ عمل کو قطعات کی صورت میں قلم بند کرتے رہے ہیں ۔ ان کے قطعات ملک کے معاشی ' معاشرتی اور تہذیبی حالات کا وہ آئینہ ہیں جس میں متوسط طبقے کی مادّی و ذہنی زبوں حالی کے خدوخال نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں ۔ قطعات کا مجموعی اسلوب طنز و مزاح ' تسلسل اور سادگی و پُرکاری کا عجائب کدہ ہے ۔ رئیس نے قطعہ نگاری کی فنّی روایات کی پابندی کے ساتھ نئے تجربات بھی کیے ہیں ۔ ان کے قطعات میں انوکھے قوافی ' تکرارِ لفظی ' ہم صَوت الفاظ ' ذومعنی الفاظ ' لفظی مماثلت ' تکرارِ حروف اور اردو انگریزی اضافتیں وہ عناصر ہیں جو ان کے تیکنیکی اجتہاد کو ظاہر کرتے ہیں ۔ چند قطعات درج ذیل ہیں ۔

فقط کشمیر و جونا گڑھ کی بربادی کا ماتم کیا

نہ جانے اور ابھی کس کس کی شامت آنے والی ہے

دکن کی سرزمیں پر بھارتی افواج کے ہاتھوں

قیامت آ چکی ہے یا قیامت آنے والی ہے

کیوں جبینِ زندگی خم ہو کسی کے سامنے

سرنگوں کب تک غرورِ خواجگی کے سامنے

ہیچ ہے ہر کفر اس شرکِ جلی کے سامنے

آدمی سجدہ کرے اور آدمی کے سامنے

شاہِ عشری عقیدہ، مجالسِ عزا اور محافلِ قصیدہ خوانی نے رئیس کو مرثیہ نگاری کی طرف راغب کیا۔ ان کے ہمہ رنگ مزاج کا بھی یہی تقاضا تھا کہ وہ اس ہمہ جہت صنفِ شعر کے ذریعے تخلیقی صلاحیتیں منظرِ عام پر لائیں۔ ان کے مرثیوں میں حُزنیہ جذبات کا مفکرانہ اظہار پایا جاتا ہے۔ میدانِ کربلا میں آلِ رسول کے یزیدی فوج سے شجاعانہ مقابلے کی داخلی و خارجی تصویر کشی ان کی محاکات نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ بے ساختگی، تاثر آفریں لہجے اور عالمانہ الفاظ و تراکیب نے ان کے مراثی کو منفرد اسلوب عطا کیا ہے۔ ہیئت کے حوالے سے اگرچہ انہوں نے قدیم مرثیہ نگاروں کی پیروی نہیں کی لیکن تخیّل کی بلندی، قدرتِ کلام اور مفکرانہ اسلوب کے اعتبار سے ان کے مرثیے دیگر شعرا کے مرثیوں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ رئیس کے ایک مرثیے "اے حسینؑ" کا ایک بند ملاحظہ ہو:

آدمیت کو تری شانِ جواں مردی پہ ناز

عالمِ انسانیت کو تیرے دم سے امتیاز

تو نے بخشا سینۂ مردم کو وہ سوز و گداز

بن گیا عزمِ بشر قسمت گر و تاریخ ساز

تیری یاد آزاد بندوں کا سہارا بن گئی

کربلا مردانگی کا استعارہ بن گئی

رئیس کے سلاموں میں شہیدانِ کربلا کے مصائب کا دردناک انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے حُزنیہ اشعار جذبات نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ انہوں نے رمز و ایما کے پردے میں واقعاتِ کربلا کے نقوش ابھار کر کے فنی خوش سلیقگی کا ثبوت دیا ہے۔ تسلسل، شُستہ و فصیح زبان کے استعمال اور پُر تاثیر اسلوب کے اعتبار سے رئیس کے سلام ان کی ایک اچھے سلام نگار ہونے کی دلیل ہیں۔ سلاموں کے اشعار کا نمونہ دیکھیں:

فقط اک تشنہ لب کے واسطے اعداء کے لشکر سے

وہ پیہم تیر کی بارش وہ تلواروں کی جھنکاریں

وہ جذبہ اللہ اللہ کربلا والوں کا وہ جذبہ

تنِ زخمی سے ان کے خون کی بہتی ہوئی دھاریں

رئیس نے تمہیدیہ اور مدحیہ دونوں اقسام کے قصائد لکھ کر متقدمین کی قصیدہ نگاری کی روایت کو قائم رکھا ہے۔ انہوں نے سیاسی و ملّی شخصیات مثلاً قائدِ اعظمؒ اور لیاقت علی خاںؒ کو بھی قصائد میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور ہماری ملکی سیاست کے نشیب و فراز پر بھی اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ رئیس نے طنزگوئی کے ذریعے قومی و معاشرتی مسائل کے اسباب سے پردہ اٹھا کر حقیقی صورتِ حال واضح کی ہے۔ مظاہرِ فطرت کے بارے میں ان کے قصائد محاکات کی رنگینیوں، مؤثر الفاظ و تراکیب اور جدتِ تخیّل کے محاسن سے آراستہ ہیں۔ وہ کبھی تشبیب، کبھی گریز اور کبھی مدح کے حصّے میں پند و نصائح کے مظہر اشعار پیش کر کے ہمارے ملّی ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلامی تہواروں کے موضوع پر

ان کے قصائد بصیرت افروز و فکر انگیز ہیں ۔ بعض قدیم قصیدہ نگاروں کی طرح رئیس نے اپنے قصائد کو غیر ضروری لفظی بازی گری سے مُبہم ' ثقیل اور مہمل نہیں کیا ۔ عربی ' فارسی ' انگریزی اور ہندی الفاظ بکثرت استعمال کرنے کے باوجود انہوں نے کلام کو الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں بنایا ۔ رئیس نے مبتذل و سوقیانہ انداز سے قصائد کو محفوظ رکھا ہے ۔ انہوں نے مرزا سودا کی طرح کٹھن اور سنگلاخ زمینوں میں قصائد لکھے ہیں اور مشکل قوافی استعمال کیے ہیں ۔ رئیس کے قصائد خوبصورت تشبیہات و استعارات ' لفظی مرصّع کاریوں ' تازگیٔ بیاں ' توازن و تناسب ' فصاحت اور نکتہ آفرینی کے اعتبار سے دنیائے قصیدہ نگاری میں منفرد مقام رکھتے ہیں ۔ " قصیدۂ نعت " رئیس کے فنی محاسن کا شاہکار ہے ۔ اس قصیدے کے مدح کے حصے میں وہ نبیؐ اکرمؐ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جو ممدوحِ خدائے دوجہاں ہو
لکھوں توصیف میں اس کی قصیدہ ؟
خموش اے میرے نُطق نا مرتب
خجل اے میری فکرِ نارسیدہ
نظامِ فکر ہو یا نظمِ اخلاق
اسی صانع کے سب نقشِ کشیدہ
مثالی جس کا کردارِ گرامی
نمونہ جسکے اوصافِ حمیدہ

قصائد کی طرح رئیس کی مثنویاں بھی قدرتِ زبان و بیاں اور فنّی پختگی کے جواہر سے مالا مال ہیں ۔ انہوں نے اپنی مثنویوں کو قدما و متوسّطین اساتذہ کی طرح موضوعاتِ حسن و عشق کے اظہار کا وسیلہ بنانے کی بجائے عصرِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا ہے اور رئیس ایک نمایاں مثنوی نگار کے طور پر سامنے آئے ہیں ۔ قیامِ پاکستان کا پس منظر و پیش منظر ' سیاست کے مدّوجزر ' سیاسی رہنماؤں کا کردار اور اہم

ملکی واقعات رئیس کی مثنویوں کے اہم موضوعات ہیں۔

وہ چونکہ تحریک و تخلیقِ پاکستان کے عینی شاہد ہیں اور سیاسی جماعتوں میں خود بھی شامل رہے ہیں ۔ اس لیے انہوں نے اپنی مثنویوں میں قومی رہنماؤں کی مساعی کو پُرجوش اور والہانہ انداز میں سراہا ہے ۔ ان رہنماؤں میں قائدِ اعظمؒ ' خواجہ ناظم الدینؒ اور لیاقت علی خانؒ سرِفہرست ہیں ۔ محسنینِ قوم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے ساتھ وہ خودغرض سیاست دانوں کے عیوب بھی منظرِ عام پر لاتے ہیں اور بے جھجک طنز کے نشتر چلاتے ہیں ۔ رئیس کی بعض مثنویاں معاشرے کے اس مظلوم و مجبور طبقے کے مسائل کی نشاندہی کرتی ہیں ہو جو بنیادی سہولتوں سے محروم ہو کر کس مپرسی کے عالم میں زندگی گزار رہا ہے۔ ان کی کچھ مثنویاں ایسی بھی ہیں جن میں انہوں نے کراچی کے مشاہدات و تاثرات پیش کیے ہیں۔ موسمی کیفیات کے بیان میں ان کے اشعار شوخی و ظرافت سے معمور ہیں۔ قدیم اساتذۂ سخن کی طرح انہوں نے اکثر مثنویوں کی ابتداء ساقی ناموں سے کی ہے۔ رئیس کی اکثر مثنویوں میں بحرِ متقارب مثمن مقصور و محذوف (فعولن فعولن فعولن فعول) استعمال کی گئی ہے۔ انہوں نے قدیم مثنوی نگاروں کے مقرّر کردہ اوزان کی پیروی کی ہے۔ ایمائیت و اشاریت ' آرائشِ لفظی ' پختہ و شیریں تراکیب ' تسلسل ' وضاحتِ بیاں اور جزئیات نگاری کی خصوصیات نے رئیس کی مثنویوں کو اسلوب کی حسن کاری عطا کی ہے۔ لالۂ صحرا اور جشنِ عید ان کی عمدہ مثنویاں ہیں۔ نمونۂ اشعار دیکھیں:

مجھے ساقیا ! کر وہ بوتل الاٹ
کہ زہّاد کو ڈانٹ دے جسکی ڈاٹ
وہ بوتل کہ جس میں وزارت اسیر
جسے پی کے بن جاؤں میں بھی وزیر
وہ بوتل کہ نشہ ہو جس کا قوی
جسے پی کے سوجھے فقط لیڈری

تجھے ان بزرگوں کی ساقی قسم

کہ جن کا عقیدہ ہے دام و درم

فارسی زبان سے مناسبت کی وجہ سے رئیس نے فارسی شاعری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کی فارسی منظومات ، غزلیات ، نعتیں ، اور منقبتیں ان کی اردو شاعری کی طرح ہمہ رنگ و ہمہ جہت ہیں۔ سربراہانِ ممالک ، دوستوں اور بزرگوں کے بارے میں ان کی فارسی منظومات تاثر آفرینی ، قدرتِ کلام ، شوخی اور نکتہ سنجی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ معاملاتِ حسن و عشق اور درد و الم کے موضوعات پہ صدیوں سے فارسی شعراء طبع آزمائی کرتے رہے ہیں ۔ رئیس نے اپنے کلام میں حسن و جمال کی داستانیں بھی رقم کی ہیں اور عشقِ خانہ خراب کی آشفتہ سری کا حال بھی لکھا ہے ۔ علامہ اقبال کی معروف اردو نظم " شکوہ و جوابِ شکوہ " کا بامحاورہ فارسی ترجمہ رئیس کی فارسی زبان اور فنِ ترجمہ پر گرفت کا ایک اہم ثبوت ہے ۔ انہوں نے اکثر قدیم فارسی شعراء کے کلام کا مطالعہ کیا تھا ۔ اسی وجہ سے فارسی کی قدیم کلاسیکی روایات ان کے مزاج میں رچ بس گئی تھیں ۔ انہوں نے اسلوبِ کلام کی عمارت دلکش تشبیہات و استعارات ، خوبصورت تراکیب ، لفظی شان و شوکت اور شوخی پر استوار کر کے فارسی شاعری میں اہم مقام حاصل کر لیا ہے ۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

آنچہ از عشق و وفا آموختیم

از حسینؑ کربلا آموختیم

عظمتِ حق از حسینؑ کربلاست

کارواں سالارِ مردانِ خداست

مجھے نسبت اگر پائے نگہ می لرزد

ہر کجا می نگرم دیدۂ تر درپیش است

پابہ گل از اثرِ گریۂ یاراں گشتیم

بگذر آہستہ کہ خوں تابہ کمر درپیش است

رئیس کی فارسی شاعری سبک ہندی میں ہے اور تازگیٔ فکر اور فنی اپج کے اعتبار سے انفرادی شان رکھتی ہے۔

شہاب دہلوی کی غزل کے عناصر ترکیبی

جناب شہاب دہلوی کی خدمات جہاں ایک ادیب، صحافی، نقاد اور محقق کی حیثیت سے ناقابل فراموش ہیں، وہاں بہاول پور کے ایک کہنہ مشق اور ممتاز شاعر ہونے کے حوالے سے وہ سخنوروں میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا حمدیہ، نعتیہ اور دیگر کلام بھی اگرچہ خاصا معیاری ہے تاہم وہ بنیادی طور پر ایک غزل گو شاعر ہیں۔

اردو غزل اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے ہر دور میں مقبول عوام و خواص رہی ہے۔ شعراء نے اسے داخلی و خارجی تجربات و مشاہدات کے اظہار کا ذریعہ بنا کر انسانی امنگوں کا ترجمان بنا دیا۔ ہر شاعر نے اس گل سدا بہار کی خون دل سے آبیاری کی اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جسے سب سے زیادہ پذیرائی حاصل ہے۔ ہر غزل گو شاعر نے اس میں خوبصورت اضافے کئے ہیں اور اب یہ صنف شاعری تیزی سے اپنی منزل ارتقاء کی طرف گرم سفر ہے۔

جناب شہاب دہلوی کی غزل میں تغزل کے وہ تمام اجزاء نظر آتے ہیں جو غزل کا طرہ امتیاز ہیں۔ رمزوکنایہ اور اشاریت کا غزل کے بنیادی عناصر میں شمار ہوتا ہے۔ شہاب دہلوی کی غزل میں ہم یہ عناصر بدرجہ اتم دیکھتے ہیں۔ انہوں نے کم سے کم الفاظ استعمال کر کے وسیع مفاہیم کو غزل میں سمو دیا ہے۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

ؔ

یا مجھ سے میری حسرت نظارہ چھین لو
یا وہ نظر بھی دو کہ تم آؤ نظر مجھے

درد و غم لازمہ حیات ہیں۔ انسان روز ازل سے دکھ درد کی بھٹی میں جلتا رہا ہے۔ اس سے کسی انسان کو مفر نہیں۔ مختلف شعراء نے مختلف انداز سے احساس الم کو شعروں کا روپ دیا ہے۔ شہاب صاحب کا انداز ملاحظہ ہو۔

مری زندگی کی ہے روداد کیا
الم، درد، آشفتگی اور بس

ؔ

ہجوم غم میں گرفتار آدمی ہے بہت
سواد حشر تو کیا اپنی زندگی ہے بہت

وہ غم کو زندگی کا ایک ناگزیر حصہ سمجھتے ہیں اور اسے ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ وہ صبرواستقامت سے زندگی کی راہوں پر رواں دواں رہنا چاہتے ہیں اور رنج و غم کا شکار ہو کر بھی خود کو مایوسی و ناامیدی کے بحر بے کراں میں غرق نہیں ہونے دیتے۔ ان کی رجائیت پسندی ایک حوصلہ آفریں پیغام بن کر امیدوں کے چراغ سینوں میں روشن کر دیتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

ؔ

ہمیں نامرادی کا طعنہ نہ دیجئے، ہم آلام کو بھی سمجھتے ہیں راحت
اگر ہم شکست وفا مان لیتے، ہمارے لبوں پر تبسم نہ ہوتا

ؔ

حادثے کیا کیا نہ آئے زندگانی میں شہاب
یہ الگ ہے ہم رہے کانٹوں میں پھولوں کی طرح

شہاب دہلوی کی غزل داخلی جذبات و احساسات کا حسین مرقع ہے۔ اس کے باوجود بدلتے ہوئے حالات پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ اس دور منافقت میں کبھی اہل سیاست پر طنز کے نشتر چلاتے ہیں اور کبھی دوستوں کی بے رخی و بے مہری کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔ اشعار کے تیور دیکھیں۔

ؔ

پھول ہوں پامال، کانٹے زینت دستار ہوں
کس نے ڈالی ہے چمن میں ان اصولوں کی طرح

دوستی کا بھی ہے موسم سے تعلق شاید
رت بدلتی ہے تو کیوں لوگ بدل جاتے ہیں

کانٹوں پہ بہار کا گماں ہے
پھولوں نے بدل لئے ہیں چولے

ہر دور میں ہوا ہے گلستاں خزاں سپرد
ہر دور میں بہار کو سمجھا گیا درست

معاملات حسن و عشق شعرا کے محبوب موضوعات رہے ہیں۔ شاب نے بھی حسن کی حشر سامانیوں اور عشق کی وارداتوں کو موضوع سخن بنایا ہے لیکن ان کی غزل کی خوبی یہ ہے کہ اشعار میں کہیں ابتذال اور سطحیت کا رنگ نظر نہیں آتا۔ نمونہ کلام پیش خدمت ہے۔

ہم نے اپنے عشق سے رتبہ بڑھایا حسن کا
جس حسیں کو ہم نے چاہا، رونق محفل بنا

نگاہ شوق ترے حسن کے نظارے کو
زمانے بھر کی نگاہوں سے روشنی مانگے

جب تجھے سامنے رکھ کر میں غزل لکھتا ہوں
لفظ کاغذ پہ ستاروں میں بدل جاتے ہیں

جا پہنچے جہاں پہ حسن دیکھا
یہ دل ہیں کہ ہیں اڑن کھٹولے

جناب شاب دہلوی چونکہ خود ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور ایک شریف النفس انسان ہیں۔ اس لئے ان کے افکار پر ہمیں تصوف کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ صوفیانہ رنگ نے ان کی غزل کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

رنگ سخن دیکھیں

؎

نصیب دولت و ثروت بھی عزو جاہ بھی ہے
مگر یہ کہیے، سکون دل و نگاہ بھی ہے

انسان عمر بھر عہدہ و منصب اور مال و زر کے حصول کے لئے تگ و دو کرتا ہے اور جب وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو موت اس کے درحیات پر دستک دینے لگتی ہے۔ اس وقت انسان کی بے چارگی اور افسوسناک حالت دیدنی ہوتی ہے۔ شاب صاحب کا اس کیفیت میں ڈوبا ہوا ایک شعر پیش خدمت ہے۔

؎

خورشید جوانی ڈوب گیا اور شام کا ہنگام آ بھی گیا
ہم زیست کی حسرت کرتے رہے اور موت کا پیغام آ بھی گیا

آج کا انسان اپنی آنکھوں پر حرص کی پٹی باندھ کر اپنے ہی ابنائے جنس کا گلا کاٹنے میں مصروف ہے۔ سوچوں کا معیار پست ہو گیا ہے اور انساں روح انسانیت سے بیگانہ ہو گیا ہے۔ شاب دہلوی کا فکر انگیز شعر ملاحظہ ہو۔

اب آدمی کو نظر آدمی نہیں آتا
چراغ فکر جلاؤ کہ تیرگی ہے بہت

شہاب دہلوی کی غزل میں پاکیزگی، وقار اور متانت ہے۔ انہوں نے رندی و ہوس ناکی اور جذباتی و سطحی مضامین سے ہمیشہ اجتناب کیا اور اعلیٰ و مثبت افکار کے موتیوں سے دامن غزل کو مالا مال کر دیا۔

عارف رحمانی کے فکری زاویئے

جناب عارف رحمانی شعراء کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو شاعری میں کلاسیکی روایات کا پاسدار اور زندگی کے شائستہ رویوں کا امین ہے۔ آج کے دور کی شاعری کا بیشتر حصہ قواعد زبان سے عاری اور مفہوم سے یکسر خالی ہے۔ نام نہاد جدت پسندی نے قوم کے قیمتی اذہان کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔

قحط الرجال کے اس دور میں عارف رحمانی جیسے شعراء کا دم غنیمت ہے جنہوں نے قدیم شعری روایات کے ورثے سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "حسن گل" ان کی قادرالکلامی اور مہارت فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

جب انسان حوادث زمانہ کی زد میں آتا ہے اور حالات کے نشیب و فراز اسے پریشانی سے دو چار کرتے ہیں تو اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اسے گرداب بلا سے نکالے۔ اس کی دستگیری کرے۔ اس کے مسائل حل کرے۔ اسے صعوبات و مشکلات کی دلدل سے نکال کر مسرتوں سے ہم کنار کرے۔ اس وقت صرف خدائے واحد کی ذات ہی اسے اپنی معاون و مددگار نظر آتی ہے اور کون ہے جو منزل مقصود پر پہنچائے۔
بقول عارف رحمانی

؎

جب رہ ہستی کے پیچ و خم نے بھٹکایا مجھے
رہبری کے واسطے تیرا تصور آ گیا

سفینہ ڈوب گیا آ کے جب لب ساحل
پتہ چلا کہ خدا کیا ہے ناخدا کیا ہے

جب ابتر حالات میں خداوند تعالیٰ کو یاد کیا جاتا ہے اور وہ اپنے مجبور بندے کی پکار سن کر اس کی مصیبتیں دور کر دیتا ہے تو بندے کا خدا کی ذات پر یقین پختہ ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ہر مقام پر اپنے منتہائے مقصود پر نظر رکھتا ہے۔ بقول عارف

میرا گھر ہو' تیری مسجد ہو کہ ہو صحن حرم
میں جہاں سجدہ کروں حاصل سجدہ تو ہے

جب یہ دعویٰ کیا جائے کہ رب جلیل کی ذات عالی ہی محور و مرکز ہے تو ظاہری وابستگی کے ساتھ ساتھ باطنی تعلق کو بھی مستحکم و پائیدار کرنا چاہئے۔ تاکہ جس بات کا زبان اقرار کرے' دل بھی اس کی گواہی دے۔

ــہ

دل میں بھی تو پنہاں ہو کوئی داغ محبت
سجدوں کے نشاں ہی کو تو ایماں نہیں کہتے

حق گوئی اللہ والوں کا شعار رہا ہے۔ جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے والا بخوبی جانتا ہے کہ اس کے لئے جرات و بے باکی اور ایمان کی پختگی کی ضرورت ہے۔ داعی حق کو صرف رضائے الہی مطلوب ہوتی ہے' لوگوں کی رضامندی یا خفگی اس کے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔

کوئی سچ بات کہہ گیا عارف
ساری دنیا خفا سی لگتی ہے

مردان حق پر جب بھی ابتلا و آزمائش کی گھڑی آئی تو وہ بے خطر آگ میں کود گئے۔ ان کے یقین کامل کا ثمر انہیں نصرت حق کی صورت میں نصیب ہوا۔ نار' گلزار میں تبدیل ہوگئی۔

آئی جب سخت گھڑی حق کے پرستاروں پر
پھول کھلتے ہوئے دیکھے گئے انگاروں پر

راہ حق پر چلنے کے لئے تزکیہ نفس بہت ضروری ہے۔ بغض' کدورت' رشک اور حسد کی آلائشوں سے دامن دل کو پاک و صاف کئے بغیر رضائے الہی کی منزل حاصل نہیں ہوسکتی۔

اس وقت تک ظاہری احوال کی درستگی سود مند ثابت نہیں ہو سکتی جب تک باطن میں نفسانیت کے بھڑکتے ہوئے شعلے ٹھنڈے نہ ہوں۔

جلتے گھر کی آگ تو عارف لوگ بجھا ہی دیتے ہیں
دل سے لیکن رشک و حسد کی آگ بجھانا مشکل ہے

موجودہ دور میں خود غرضی اور بے حسی نے ایثار' ہمدردی اور انسان دوستی کے جذبوں سے دلوں کو یکسر خالی کردیا ہے۔ اس صورت حال میں جب مادی آسائشات کے حصول کی دوڑ میں ہر شخص دوسرے سے آگے نکل جانے کی فکر میں مبتلا ہو' مجبوروں کی فریاد کون سنے؟ سب کچھ دیکھتے اور سنتے ہوئے بھی لوگ اندھے اور بہرے بن کر غریبوں اور مظلوموں کے مسائل کو نظرانداز کردیتے ہیں۔

ــہ

دکھلائیں کسے بربادی دل اور کس سے یہاں فریاد کریں
یہ شہر ہے اندھوں' بہروں کا چل اور نگر آباد کریں

کچھ لوگ اپنی مطلب براری کے لئے دوسروں کو دھوکہ دینا بھی جائز سمجھتے ہیں لیکن کچھ لوگ فریب کھا کر بھی دوستانہ تعلقات قائم رکھتے ہیں۔

دوستی میں فریب کھانا ہی
حاصل دوستی سمجھتا ہوں

دنیا دوستی کے لازوال رشتے کی قدر شناس نہیں اور ہر شخص کی دوسرے کی جیب پر نظر لگی ہے۔ اہل وفا اس وقت دوستوں کے اصلی چہرے کو پہچانتے ہیں جب ان کا سب کچھ لٹ چکا ہوتا ہے۔ عارف رحمانی نے اس سنگین حقیقت کو کتنی خوبصورتی سے شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے۔

من کی قدر نہ جانے کوئی دھن کے سب دیوانے ہیں
سب کچھ بھینٹ چڑھا کر ہم اس دنیا کو پہچانے ہیں

اس دور ہوس میں نام نہاد محبان وطن نہ صرف غیروں بلکہ اپنوں کو بھی مختلف حیلوں اور بہانوں سے لوٹنے میں مصروف ہیں۔

یہ دور ہوس توبہ اس دور میں روزانہ
لٹتے ہوئے دیکھا ہے گلشن ہو کہ ویرانہ

بانٹ لیتے ہیں جو آپس میں وطن کے ٹکڑے
ہم نے ایسے بھی محبان وطن دیکھے ہیں

عارف رحمانی کی شاعری میں غم جاناں کا سوز و گداز بھی اپنی ارفع شکل میں موجود ہے اور غم دوراں کی کرب ناکی بھی مکمل پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ اگرچہ بعض اوقات درد و غم کی کسک چیخ کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے تاہم عارف رحمانی غم و اندوہ کو ایک حقیقت سمجھتے ہوئے بھی اسے زندگی پر طاری نہیں ہونے دیتے۔ ان کا غم بھی رجائیت آلود ہے۔ وہ مایوسی و قنوطیت کے شاعر نہیں۔ وہ دکھوں کی شمشیر براں کے وار سہہ کر بھی مسکرانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

نوک مژگاں تک آیا جو احساس غم
اشک بن کر وہ رشک گہر ہو گیا

اشک آتے ہیں تو ہنس دیتا ہوں فطرت کے خلاف
دیکھ کتنا پاس آداب وفا رکھتا ہوں میں

معنی سمجھ کے صبر و سکون و قرار کے
بوسے لئے ہیں دل نے غم روزگار کے

میں کیوں غم اٹھاتا میں کیوں رنج سہتا
اگر ان سے حاصل مسرت نہ ہوتی

"قانون مکافات" ایک منفرد علمی سوغات

تفکر و تعقل' اشرف المخلوقات ۔ حضرت انسان کا وہ پر عظمت و شوکت خاصہ ہے جو اسے کرہ ارض پر بسنے والی تمام ذی روح خلائق سے ممیز و ممتاز کرتا ہے۔

خلقت کائنات کے ابتدائی دور سے عصر تازہ کے لمحات موجود تک ادیب' شاعر' مصلح' فلسفی' سائنسدان اور دیگر علوم و فنون سے وابستہ اشخاص زندگی اور کائنات کے تہہ در تہہ اسرار کی عقدہ کشائی کے نئے نئے پیمانے تلاش کرتے رہے ہیں اور حیات و کائنات کے باہمی ربط کی کھوج میں سرگرداں رہے ہیں۔ ادباء و شعراء نے اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے حقائق و معارف کے خدوخال پہچاننے کی کوشش کی ہے اور فکر و خیال کے جال پھینک کر مخفی رموز کو اپنے احاطہ گرفت میں لاتے رہے ہیں۔

ان کے علاوہ اہل فکر و نظر کا ایک خاص الخاص گروہ بھی ابتدا ہی سے سرگرم عمل رہا ہے۔ جس نے ادیان عالم' بصیرت یاب دانش وروں کے صالح تفکر اور زیرک فلسفیوں کے دلائل و براہین کی بنیادوں پر اپنے افکار کے پرشکوہ ایوان تعمیر کئے۔

مرزا انور بھی ایسی ہی معدودے چند شخصیات میں سے ہیں جن کے ذہن رسانے طویل عرصے تک اہل دانش کے علمی ذخیرے سے اکتساب فیض کیا۔ ان گراں بہا موتیوں کی مالا -- اور گلہائے رنگا رنگ کا گلدستہ "قانون مکافات" اہل علم و فن کے لئے ایک ایسی منفرد کتاب ہے جو اذہان کی بنجر کھیتیوں کے لئے یقیناً ابر بہار ثابت ہوگی۔

یہ کتاب ان کی برسوں کی ریاضت کا ثمر' عمیق مطالعے کا نچوڑ اور تجربات و مشاہدات کا ماحصل ہے۔ کتاب کا نام اس کے موضوعات کا نمائندہ ہے۔ "قانون مکافات" میں عمل اور اس کے منطقی رد عمل کی فطری و قدرتی تصویر کشی کی گئی ہے۔

اس کتاب میں انسان کی خداداد بے پایاں صلاحیتوں' منعم حقیقی کے انعامات کے خزانوں' انسان کی ناشکرگزاری' حیات چند روزہ کے دوران اندھی خواہشوں کی تکمیل میں انسان کا مجنونانہ کردار اور عبرت گاہ عالم کے دلدوز واقعات کی تفصیل نہایت موثر اور دل نشیں انداز میں بیان کی گئی ہے۔

"قانون مکافات" کا آغاز قرآن پاک و انجیل مقدس کی آیات کے تراجم سے کیا گیا ہے۔ جو بلاشبہ ایک مستحسن روایت ہے۔ بعد ازاں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ، قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ، نتشے اور برناڈشا کے عارفانہ و پرحکمت اقوال شامل کتاب کر کے مصنف نے ایمان افروز و بصیرت انگیز فضا قائم کی ہے۔ زیادہ تر ایسے موضوعات احاطہ تحریر میں لائے گئے ہیں جو ہماری معاشرتی و سماجی زندگی کے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر مسئلے کا تجزیہ کرنے سے پہلے مصنف کے ذہن میں یہ سوالات موجود رہے ہیں کہ مسئلہ کیا ہے؟ یہ کیوں پیدا ہوا ہے؟ اور اسے کیسے حل کیا جاسکتا ہے؟ مرزا انور نے بڑی ژرف نگاہی اور باریک بینی سے زندگی کے حقائق کا مشاہدہ کیا ہے اور انہیں بڑی شائستگی و عمدگی سے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ ایسے موضوعات پر لکھنے والے اہل قلم عموماً علمی اصطلاحات سے اپنی تحریر کو بوجھل اور ثقیل کردیتے ہیں جس سے عام قاری کو اس کی تفہیم میں دشواری محسوس ہوتی ہے اور اس طرح اس کی افادیت کم ہو جاتی ہے۔ مرزا انور کی تحریر کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ سادہ سہل اور رواں اسلوب کی حامل ہے۔ الفاظ کا انتخاب نہایت سلیقے سے کیا گیا ہے۔ کہیں کوئی لفظ بے موقع استعمال نہیں کیا گیا۔ ہر جملہ نہایت برجستہ و برمحل ہے۔ غیر ضروری طوالت اور بے جا لفاظی کہیں نظر نہیں آتی۔ تحریر میں اختصار کے ساتھ ساتھ جامعیت و پرکاری بھی عروج پر نظر آتی ہے۔ مصنف نے زندگی آمیز و زندگی آموز افکار کے قیمتی خزانے کتابی شکل میں محفوظ کردیئے ہیں۔ مرزا انور صرف حقائق کے سمندر کی سطح کا منظر ہی نہیں دیکھتے اور نہ فقط ساحل پر بکھری ہوئی سیپیاں ہی ان کے مشاہدے کا ہدف ہیں بلکہ وہ اس کے اندر جھانک کر زیریں لہروں کے تموج کا نظارہ کرتے ہیں اور طوفانوں کی ہر آہٹ کو ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں۔ ان کی غوطہ زنی کا نتیجہ پوشیدہ رموز کے گہرہائے آبدار کی رونمائی کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔

نفسیاتی عوامل کی فلسفیانہ توجیہ و تشریح کے لئے غیر معمولی ذکاوت و بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرزا انور کو قدرت کی طرف سے گہرائیوں میں اتر کر تجزیہ کرنے کی صلاحیت ودیعت کی گئی ہے۔ مجموعہ مضامین "قانون مکافات" اہل فکرونظر کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ فکری انحطاط کے اس دور میں ایسی کتب کی ملک و قوم کو اشد ضرورت ہے تاکہ مسلمانوں کے دلوں میں اپنی گم گشتہ میراث کے تحفظ کا احساس پیدا ہو اور اقوام عالم میں اپنا زوال پذیر تشخص بحال کرسکیں۔

"موج نور" کا تجزیاتی مطالعہ

ہر دور میں عظیم و باکمال شخصیات نے سیاسی، ثقافتی، دینی، علمی، ادبی اور دیگر حوالوں سے کارہائے نمایاں سرانجام دے کر بہاول پور کی شناخت کو معتبر کرنے کے لئے بے مثال کردار ادا کیا ہے۔

ان شخصیات میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں جنہوں نے اسی دھرتی کی آغوش میں جنم لیا اور کچھ ایسے ہیں جو مختلف علاقوں سے یہاں آکر آباد ہوئے۔ جناب سید مسعود حسن شہاب دہلوی کا تعلق موخر الذکر افراد سے ہے۔ انہوں نے دہلی سے ترک سکونت کر کے بہاول پور میں مستقل رہائش اختیار کی۔ بطور ادیب، شاعر، صحافی، مورخ اور محقق انہوں نے جو شاندار خدمات سرانجام دیں، ناقابل فراموش اور باعث فخرو اعزاز ہیں۔

ان کی ہمہ پہلو و ہمہ اوصاف شخصیت نے ہر میدان میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ بالخصوص چمنستان شعروادب میں انہوں نے جو سدا بہار پھول کھلائے، ان کی خوشبو تادیر ذہنوں کو معطر رکھے گی۔ مختلف اصناف شعر پر ان کی یکساں دسترس، ان کی قادرالکلامی اور مہارت فن کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔ حمد ہو یا نعت، غزل ہو یا نظم، مرثیہ ہو یا قصیدہ، شہاب دہلوی کا قلم ہر صنف شعر کے میدان میں یکساں رواں دواں نظر آتا ہے۔

کسی تخلیق کار کو اس کی تخلیق سے جدا کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ فنکار کی شخصیت کی پرچھائیاں اس کے فن پاروں میں رونما ہو کر اس کے فکری خدوخال کا آئینہ بن جاتی ہیں اور اسی طرح اگر کسی کے شخصی کمالات کو جانچنے اور پرکھنے کی خواہش ہو تو اس کے فن کا دریچہ کھول کر اس کے کردار کے ہر شوخ اور دھندلے منظر سے جان پہچان کی جاتی ہے۔

شہاب مرحوم صوم صلوٰۃ کے پابند، راستباز اور نیک سیرت انسان تھے۔ ان کے دیگر کلام میں ان کے پاکیزہ افکار جس طرح ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں، ویسے ہی ان کا حمدیہ و نعتیہ کلام ان کے اسلامی خیالات کا مظہر ہے۔ شہاب دہلوی کو بزرگان دین اور صوفیائے کرام سے گہری عقیدت تھی۔ اس عقیدت نے ان کی زندگی کے ہر گوشے پر انمٹ اثرات چھوڑے۔ ان کا اخبار "الہام" ان کے نظریات، معتقدات اور دیگر فکری جہتوں کی بھرپور غمازی کرتا ہے۔ ان کی صوفیانہ و عارفانہ سوچوں کا دھارا ان کی ہر تحریر میں موجزن

دکھائی دیتا ہے۔ شہاب دہلوی کی دیگر کتب کی طرح ان کا شعری مجموعہ "موج نور" ان کی دین سے گہری وابستگی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ "موج نور" جہاں شہاب دہلوی کی فنی عظمتوں کی ایک موثر دلیل ہے وہاں یہ مرحوم کے لئے آخرت کا سرمایہ بھی ہے۔

عقیدتوں کا یہ بیش بہا نذرانہ حمدوں' نعتوں' سلاموں' قصائد اور مرثیوں پر مشتمل ہے۔

"موج نور" میں اسرار معرفت الٰہی بھی ہیں اور حب رسول ﷺ کے انمول نگینے بھی جلوہ فشاں ہیں۔ اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے معروف سخنور سید ہاشم رضا نے اپنے تاثرات کو منظوم شکل میں پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

یہ صرف شعر نہیں معرفت کے ساغر ہیں
جو چاہے آئے بھرے دل کے آبگینوں کو

"موج نور" کے آغاز میں جناب سید ہاشم رضا نے اپنے مضمون میں ریاست بہاول پور میں اپنے قیام کے دوران کچھ واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے جناب شہاب سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے منتخب کلام کے کچھ نمونے پیش کئے ہیں۔ "بر سبیل تذکرہ" کے عنوان سے شہاب دہلوی نے اپنے شعری مجموعے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"زیر نظر مجموعہ انہی پاک ہستیوں کے فضائل و مناقب میں نعت و قصائد' سلام و منقبت اور مرثیوں پر مشتمل ہے' جس سے مقصود اظہار کمال نہیں بلکہ اظہار عقیدت و سپاس ہے۔ میں نے توشہ آخرت کے طور پر انہیں مرتب کر کے شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے اور اللہ رب العزت کی شان کرم سے یہ امید رکھتا ہوں کہ وہ بہ طفیل محمد ﷺ میرے اس حقیر نذرانے کو شرف قبولیت سے نوازے گا۔"

کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے خالق کی صفت خالقیت کی گواہی دے رہا ہے۔ سورج' چاند' ستارے' جنگل' پہاڑ' وادیاں' صحرا --- تمام مظاہر فطرت صانع دوعالم کی کاریگری کے شہکار ہیں۔ چشم بینا ہر منظر میں رب ذوالجلال کی قدرت کے جلوے دیکھ لیتی ہے۔ بقول حضرت شہاب دہلوی

تیری قدرت سے روز و شب کا ظہور
ہر نظارے میں رونما تو ہے
بحر و بر ہوں کہ آسمان و زمین
ہر طرف تو ہے' جا بجا تو ہے
ہے مناظر میں تیرا عکس جمال
سب میں رہ کر بھی ماوری تو ہے

انسان جب اپنی احتیاجات کا رخ دنیا کی طرف کرتا ہے تو وہ اس سے گہری توقعات وابستہ کر لیتا ہے لیکن جب بے مہری و بے رخی کے پتھروں سے دنیا اس کا آئینہ خواہشات چور چور کرتی ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ دست سوال دراز کر کے اس نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ جو خود محتاج ہو وہ دوسرے کی احتیاج کیا پوری کرے گا۔ یہ سوچ کر انسان اس عظیم ہستی کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس کی بارگاہ آخری جائے اماں ہے۔ بقول شہاب دہلوی

تجھ سے رحم و کرم کی سب کو امید
سر بسر بخشش و عطا تو ہے
کس کے در پر شہاب دے دستک
بے سہاروں کا آسرا تو ہے

تو کہ ستار بھی' غفار بھی' رحمان بھی ہے
تیرے الطاف و عنایت کی کوئی حد ہی نہیں
تو جو چاہے تو سفینے کو کنارا مل جائے
تو اگر چاہے تو پائے دل مضطر تسکیں

حضور ﷺ کی محبت کو جب تک جزو ایمان نہ سمجھا جائے' معرفت خداوند قدوس کا حصول مشکل ہے۔ اس نکتہ لطیف کو شہاب دہلوی منکشف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

کیوں نہ اس کے آستاں پر ہم جبیں سائی کریں
جس کی خاک پا کے ذرے عرش پیمائی کریں

جنہیں حضور ﷺ کی غلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے، سلاطین جہاں کے تاج و تخت ان کے قدموں کی خاک بن جاتے ہیں۔ بادہ عشق نبیؐ میں سرشار غلامان محمد ﷺ بوریا نشین ہوتے ہوئے بھی آسمانی رفعتوں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ وہ زمین پر رہ کر بھی نظارہ افلاک کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

شہاب دہلوی فرماتے ہیں۔

عجب تھی بادہ عشق نبیؐ کی سرجوشی
رہے زمیں پہ ہم لیکن آسمان کی طرح
غلام ہم بھی ہیں ان کے بلال کی صورت
ہمارے دل کی بھی ہیں دھڑکنیں اذاں کی طرح

حادثات و مصائب کی آندھیاں جب دلوں کے چمن زاروں کو تاخت و تاراج کرتی ہیں۔ جب طوفان مصائب کشتی حیات کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے تو شفیع المذنبین، رحمتہ العالمین محمد ﷺ بے اختیار یاد آتے ہیں۔ شہاب دہلوی نے امت مسلمہ کے مصائب و مسائل کا موثر الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے۔ ان کی ایک نعتیہ نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

ہر شخص ہے حیران و پریشان و دل افگار
موجیں ہیں بلاخیز، قیامت کا ہے منجدھار
ماحول موافق ہے نہ قابو میں ہے پتوار
امت کا سفینہ ہے مصائب میں گرفتار
یا سید الابرار

بیداد کے جھکڑ ہیں تھپیڑے ہیں ستم کے
روکے سے بھی رکتے نہیں طوفان الم کے
محتاج ہیں ہم آپ کی اب چشم کرم کے
اب کشتی امت کو اشارے سے کریں پار
یا سید الابرار

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں شہاب دہلوی کا ہدیہ عقیدت ملاحظہ فرمائیں۔

وہ باب علم بھی ہے، علم کا خزینہ بھی
وہ مہر ختم نبوت کا ہے نگینہ بھی
وہ اوج ملت اسلام کا ہے زینہ بھی
ملا ہے دل بھی محمدؐ سے اس کا سینہ بھی
ہے بوئے عشق محمدؐ سے تر پسینہ بھی
وہ جس طرف سے بھی گزرا وہی مہک آئی

شہید کربلا، نواسہ رسول، جگر گوشہ بتول حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت محمد ﷺ نے فرمایا تھا کہ حسین منی و انا من الحسین

جناب شہاب کے سلام کے دو بند دیکھیں

نہ سر کٹاتے تو اسلام کس طرح بچتا
رضا خدا کی حقیقت میں تھی رضائے حسینؓ
شریک کرب و بلا سارا خاندان ہوا
اس امتحاں کی کسے تاب تھی سوائے حسینؓ
شہاب ذوق عمل کی فقط ضرورت ہے
جبین دہر پہ روشن ہیں نقش پائے حسینؓ

حسینؓ عزم کی تصویر، پاسبان حرم
حسینؓ صبر کا پتلا، حریف جاہ و حشم
حسینؓ حلم کا پیکر، حسینؓ تیغ دودم

جعفر بلوچ کی دو اہم تصنیفات کا مختصر جائزہ

اقلیم

جناب جعفر بلوچ کا نام محتاج تعارف نہیں۔ وہ ایک عرصے سے سرزمین سخن میں تخم پاشی کر رہے ہیں۔

''اقلیم'' ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ اس مجموعے کی ابتدا میں ''اظہار تشکر'' کے عنوان سے جناب جعفر بلوچ کی چند سطور شائع کی گئی ہیں۔ بعد ازاں ''جعفر بلوچ - دیار ادب کا ایک نیا ریا'' کے عنوان سے پروفیسر صابر لودھی کا ایک پر مغز مضمون شامل کتاب ہے۔ صاحب کتاب کے بارے میں پروفیسر تحسین فراقی کا مضمون ''جعفر بلوچ اور ان کا رنگ سخن'' بھی خاصا وقیع اور جاندار ہے۔ اس مضمون میں تحسین صاحب نے سوانحی پس منظر میں جناب جعفر بلوچ کے فنی خدوخال اجاگر کئے ہیں۔ حمد و نعت کے بعد غزلیات و منظومات شریک اشاعت ہیں۔ فلیپ میں محترم ڈاکٹر سید عبداللہ رقم طراز ہیں۔

> ''جعفر بلوچ کا دیوان شعر کہ اسے اقلیم معنی کہیئے ہر صنف پر مشتمل ہے۔ غزل، نظم، قطعہ، نعت و منقبت ہر صنف میں خوب لکھا ہے اور دوسرے شعرائے عصر سے الگ، انوکھا لکھا ہے۔ تازگی، توانائی، قوت، حرارت اس میں سب کچھ ہے۔ شکوہ و شکایت، غم و شادی، سماجی اور معاشرتی حقیقتیں بڑے تیکھے انداز میں بیان کی ہیں۔''

ٹائیٹل کے دوسرے اندرونی صفحے پر جناب جعفر بلوچ کی تصویر اور مختصر کوائف درج ہیں۔ جعفر بلوچ شعراء کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو زندگی کی معنوی صداقتوں اور آفاقی قدروں پر پختہ یقین رکھتا ہے۔ پیش نظر اردو شعری مجموعہ ''اقلیم'' ان کے طویل شعری سفر اور فنی ریاضت کا عکاس ہے۔ ''اقلیم'' میں شامل غزلیات و منظومات اپنے طنزیہ اسلوب، رمزوایماء، شدت احساس اور ندرت فکر کی وجہ سے جناب جعفر بلوچ کی انفرادیت کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ اعلی روایات سے استفادہ اور جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنا جعفر صاحب کا نصب العین ہے۔ ان کا ذوق سلیم عامیانہ سطح سے دور ہے۔ سچائی، انصاف، نیکی، شرافت

اور شائستگی ان کے نظریہ حیات کے اہم عناصر ہیں۔ جعفر بلوچ اپنے نظریہ فن کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

قائم رہیں گے موقف تقدیس فن پہ ہم
بے شک جہاں فریفتہ ابتذال ہو

کتاب کے آخر میں شامل منظومات "تحسین ناشناس" "روح اقبال کا احتجاج" "آپ کے شہر کی کیا روایات ہیں" حقائق کی انوکھے انداز میں نقاب کشائی کرتی ہیں۔ ان نظموں میں طنز و تعریض کا عنصر نمایاں ہے۔ لہجے کا کٹیلا پن جو جعفر بلوچ کا امتیازی وصف ہے' ان نظموں میں بتمام و کمال دکھائی دیتا ہے۔ "اقلیم" سے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

کیا سمجھے گا ہم خاک نشینوں کے مسائل
دیکھا نہیں جس نے ہمیں مسند سے اتر کر

زشت رو توڑتے ہیں آئینے
آئینوں کی ہنسی نہیں جاتی

آدمیت پر تصرف ہو گیا ابلیس کا
شیخ جی نور و بشر پر بحث فرماتے رہے

اس لئے میری غزل میں ہیں کنایات و رموز
مجھ کو سچ بھی بولنا ہے اور خوف جاں بھی ہے

اپنے چہروں کے داغ دھو نہ سکے
آئینوں پر برس رہے ہیں لوگ

آیات ادب

جناب جعفر بلوچ کی کتاب "آیات ادب" لیہ اور مظفر گڑھ کے شعراء کا تذکرہ ہے۔ اس سے قبل ان کی متعدد تحقیقی کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔ "آیات ادب" میں جعفر بلوچ ایسے معروف و غیر معروف شعراء کو منظر عام پر لائے ہیں' جن کی نگارشات اگرچہ نہایت بلند مرتبہ و قابل قدر ہیں لیکن ادبی مراکز سے دور ہونے کی وجہ سے ان کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی' جس کے وہ حقدار تھے۔ جن عظیم شخصیات کے چہرے وقت کی دبیز کہر میں چھپ گئے تھے' جعفر صاحب کی اس گرانمایہ کتاب کے ذریعے پھر نمایاں ہو گئے ہیں۔

بقول پروفیسر محمد منور

"جعفر بلوچ نے آیات ادب مرتب فرمائی اور اس طرح ہمیں بہت سے باکمال شعراء اور اہل قلم سے آگاہ ہونے کا موقع فراہم کیا۔ ہمیں معلوم ہے کہ بڑے شہروں یا بڑے علمی مراکز سے دور بھی بڑے باکمال لوگ ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے وہ صحراؤں کے پھول اپنے اردگرد خوشبو پھیلا[illegible] رہتے ہیں [illegible] مرکز میں نہ ہونے کی وجہ سے ان کی شعاعیں' خوشبوئیں اور ان کا فیض دور دور تک نہ پہنچا۔"

اس تذکرے میں لیہ اور مظفر گڑھ کے تقریباً تمام قابل ذکر شعراء کو نمائندگی دی گئی ہے۔ چند اہم شخصیات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

حضرت زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ' حضرت عبدالعزیز پرہیاروی رحمۃ اللہ علیہ' فتح محمد کلاچی' فرمان پٹیالوی' ذاکر جگرانوی' راجہ محمد عبداللہ نیاز' نواب جلال میرزا خانی' کشفی ملتانی' خلیق ملتانی' شارق انبالوی' ڈاکٹر مہر عبدالحق' نواب زادہ نصراللہ خان ناصر' ارمان عثمانی' بیاض سونی پتی' نسیم لیہ' خیال امروہوی' نافل کرنالی' اختر جعفری' عدیم صراطی' جعفر

بلوچ' شہباز نقوی وغیرہ

جعفر بلوچ صاحب نے یہ تذکرہ مرتب کرتے ہوئے معتدل' محتاط اور غیر جانبدارانہ انداز اختیار کیا ہے۔ انہوں نے شعراء کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ البتہ کلام شعراء کی خصوصیات اجاگر کرتے ہوئے غیر ضروری مدح و ستائش سے گریز کیا ہے۔ یہ ان کی متوازن سوچ کی علامت ہے۔

"آیات ادب" میں شعراء کے مختصر سوانحی حالات بیان کئے گئے ہیں اور ان کے مخصوص رنگ سخن کی نشان دہی کی گئی ہے۔ جعفر بلوچ صاحب نے اس تذکرے میں بہت شائستہ اور خوبصورت زبان استعمال کی ہے۔ اس کا اسلوب نہایت دلپذیر ہے۔ ہر سطر پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن میں شعراء کی شخصیات کے خدو خال واضح سے واضح تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جعفر بلوچ نے شعرائے کرام کے نمونہ کلام کا انتخاب بھی بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ حشو وزوائد کو چھوڑ کر اہم اور نمائندہ کلام کو ہی زینت قرطاس بنایا گیا ہے۔

۲۴۰ صفحات پر مشتمل یہ تذکرہ مرتب کر کے جہاں جعفر بلوچ صاحب نے ہماری قابل فخر علمی و ادبی شخصیات کو قعر گمنامی سے نکالا ہے وہاں علم و ادب کے شائقین پر بھی احسان عظیم کیا ہے۔ ان کا یہ کارنامہ ادبی حلقوں میں یقیناً استحسان کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ آج ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جن سے ہم اپنے عظیم اسلاف کی مساعی سے روشناس ہو سکیں۔ وہ اسلاف جن کے چہرے زمانے کی گرد میں چھپ گئے ہیں۔